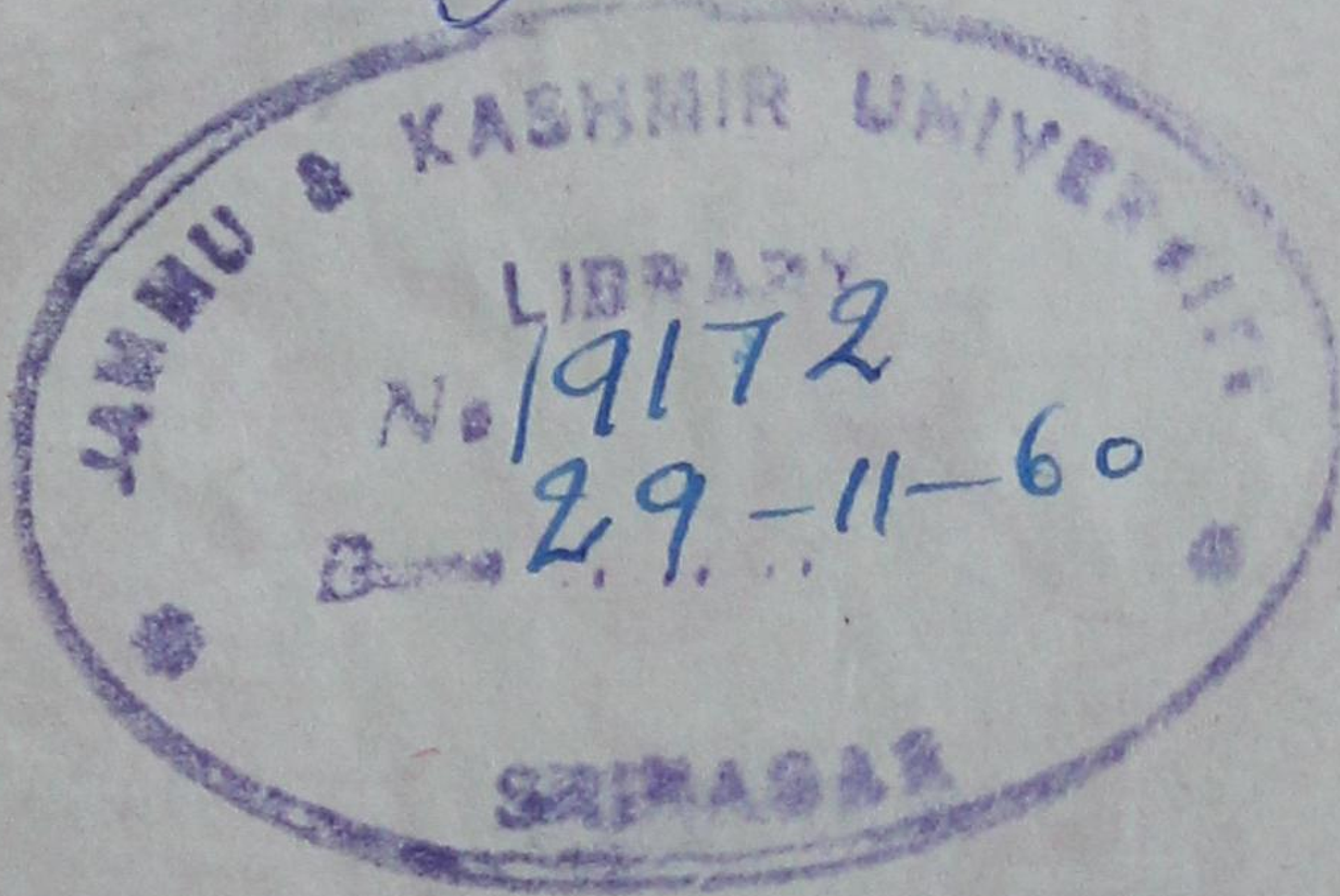


بسم اللہ الرحمن الرحیم

جوشِ فکر

سلطان حیدر جوش

قیمت ۸؍


JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 19172
29-11-60
SRINAGAR




ALLAMA IQBAL LIBRARY
19172

فہرست مضامین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

التماس

اس مجموعۂ مضامین کو ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے میں بقول مرزا غالب مرحوم "بیان حُسنِ طبیعت" سے درگزر کرتے ہوئے "گزارش احوال واقعی" پر اکتفا کرتا ہوں۔

ادب اردو کے نقاد اور صاحبانِ ذوق، اخیٔ مکرم سلطان حیدر صاحب جوشؔ کے ادبی کارناموں سے نابلد نہیں، اور نہ اُن کا نام کسی تعارف کا محتاج ہے البتہ اس امر کا علم صرف بھائی صاحب کے اعزہ اور مخصوص احباب تک محدود ہوگا کہ انھوں نے ناول نگاری سے آغاز کیا اور افسانہ نگاری بعد میں اختیار کی۔ افسوس ہے کہ اُن کا پہلا ناول "ہیری" جو سنہ ۱۹۰۱ء میں دہلی میں طبع ہوا تھا۔ اب نایاب ہے۔

افسانہ نگاری کا آغاز انھوں نے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء میں شروع کیا یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی ہندوستان میں لاہور سے مخزن اور کانپور سے زمانہ

صرف دو رسالے ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت جوش نے مغربی طرز کی افسانہ نگاری اس وقت شروع کی جب موجودہ افسانہ نگاروں کی تعداد کثیر مدرسوں میں زانوئے ادب تہ کرتی ہوگی۔

اس کے علاوہ، مگر اس سے زیادہ بھائی صاحب کی مزاح نگاری اور طنزیات کا مرتبہ ہے اس میدان میں ان کی طرز نگارش نے مزاح لطیف کی داغ بیل ادب اردو میں جس طرح ڈالی اور جس حد تک اس کو مشرقی نقش و نگار سے مزین کیا وہ علم دوست اصحاب سے پوشیدہ نہیں۔ حضرت جوش کی سوانح نگاری نہ اس مختصر تحریر میں ممکن ہے اور نہ اس کی مجھے اجازت ہے اس لئے میں اس موضوع کو نہیں چھوڑتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت جوش کے پرکیف مضمون۔ مخزن تمدن۔ الناظر۔ نقیب۔ زمانہ۔ کہکشاں۔ ظل السلطان۔ ذخیرہ۔ بہارستان۔ ہمایوں اور نیرنگ خیال کے توسل سے ملک کے ہر گوشہ میں پہنچتے تھے مگر اب عرصہ ہوا کہ، خود اُن کے الفاظ میں، قیصر ہند اور ملازم کے باہمی کش مکش نے ان کے اوقات پر قبضہ کرلیا ہے۔ ان کا مقبول عام ناول "ابن مسلم" جو ۱۹۱۲ء سے دو مرتبہ شایع ہوا اب کمیاب ہو چلا ہے۔ مدیر الناظر نے ان کے چند افسانے "فسانہ جوش" کے نام سے جس قسم کی طباعت اور کتابت سے شائع کیے اس پر رائے زنی سے صرف اس وجہ سے گریز کرتا ہوں کہ میرے الفاظ کو مدیر الناظر کی ہجو نہ سمجھ لیا جائے۔

اکثر احباب و مالکان مطابع نے بھائی صاحب سے اُن کے مضامین کا

مجموعہ شایع کرنے کی اجازت چاہی مگر وہ ہمیشہ ٹالتے رہے اس فہرست میں میرا
بھی نام آتا ہے اور میں بالآخر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ ظلم یہ ہے کہ
بھائی صاحب نے اپنے افسانوں کے مسودہ کبھی نہ رکھے صرف مضمون کی سرخی
اور جس رسالہ میں وہ شایع ہوا اس کا ماہ وسنہ نوٹ کرتے رہے۔

وہ فہرست بھی ملازمت کے زیر سایہ تبادلوں کی خانہ بدوشی میں گم ہو گئی
خدا بھلا کرے بھائی وحید احمد صاحب (اڈیٹر نقیب سابق اور موجودہ صوفی
صافی) کا جنہوں نے اس کی ایک نقل بہم پہونچائی۔ اس فہرست کی رو سے مضامین
کی تعداد ستّر سے زیادہ تھی اور ان رسالوں کا حصول جن کی بڑی تعداد فنا
ہو چکی ہے۔ طلسم ہفت خواں کی پہلی منزل تھی۔ بہر حال جس قدر مہیا ہو سکے
ان کی پہلی قسط اس مجموعہ کی صورت میں نذر ناظرین کی جاتی ہے۔ حجم اور تقطیع کا
لحاظ کرتے ہوئے اس مرتبہ گیارہ مضامین اس مجموعہ کے لئے لیتا ہوں
اور اس لحاظ سے لیتا ہوں کہ افسانے اور مزاحیہ نقوش کے علاوہ علمی
ادبی معاشرتی اور ہر رنگ کے مضامین اس مختصر مجموعہ میں آجائیں اکثر
مضامین کے بے باک جملے سیاسیات کا میدان بھی نہیں چھوڑتے جو واقعی
ایک ملازم سرکار کے لئے حد ادب ہے۔ سوائے مضمون اوّل کے جو در اصل دور آخر
کا طبعزاد ہے بقیہ مضامین کی ترتیب زمانہ تحریر کے سلسلہ پر مبنی ہے مقصد
یہ ہے کہ جوش کے ارتقاء دماغی و طرز تحریر کی جھلک پیش کی جاسکے

اگر صاحبان ذوق نے اس پہلی قسط کی پسندیدگی سے حوصلہ افزائی کی تو بقیہ اقساط بھی اس کے بعد پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ مجھے اس کے اظہار میں تامل نہیں کہ بھائی صاحب کی تصویر شائع کرنے کی اوّلیت بھی مجھے حاصل ہوئی ہے کیونکہ اس سے پیشتر سالہا سال کے تقاضوں پر بھی وہ اپنی تصویر کسی سالہ میں شایع کرنے پر راضی نہ ہوئے۔

سب کے آخر میں اس امر کا اعلان باقی رہ جاتا ہے کہ جوش ایک عرصہ سے پچھمی جند بنام نادار خاں کے قانونی مخمصوں میں مبتلا رہ کر ادبی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہے مگر اب وہ غالباً "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" کے تحت میں شباب کی تصویر الفاظ میں کھینچنے پر مائل ہیں۔

اس نئی تصنیف کا نام بھی "شباب" ہوگا جو مسلسل تقاضوں کی بنا پر غالباً جلد وجود میں آنے والی ہے۔

(حاجی) محمد طیّب

طلسم ازدواج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلسم ازدواج

بوستان خیال سے طلسم نور افشاں تک' اور الف لیلہ سے فسانہ آزاد تک، کوئی داستان ایسی نہیں جس کا دارومدار محض ایک نفر مرد اور ایک عدد عورت کے اتصال جسمانی پر نہ ہو۔ موجودہ افسانے اور ناول بھی اس کلیہ سے خارج نہیں کئے جا سکتے۔ ہر افسانے کا آغاز ایک عورت کے حصول کی آرزو ہے اور انجام اس خود غرضی کی کامیابی ہے۔ اور بس۔ لیکن دنیائے جدید کی صبحی جاگتی تصویریں اس مرقع تخیل سے کوسوں دور نظر آتی ہیں۔ ماضی بعید کا نوجوان حصولِ مطلوب کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا ہو۔ مگر چودھویں صدی کا نازک اندام مرد ازدواج کے خیال سے اسی قدر گریزاں ہے جس قدر زہر کھا لینے ۔یا۔ کلوروفارم سونگھ لینے سے۔ موت اور ازدواج اس کے لئے یکساں طور پر ناگزیر و ناگوار واقعات ہیں۔ شادی واقعی ایک ہیبت ناک سانحہ ہے۔ مگر میعادی بخار اور عالم پیری بھی کسی طرح کم ہیبت ناک نہیں، اور کسی سے مفر ممکن نہیں۔

انسان کی تمام افراد پر حیوان ناطق کی تعریف صادق نہ آتی ہو مگر اس کے حیوانِ معاشرت پسند ہونے میں کوئی کلام نہیں وہ فطرتاً ہم نشین و ہم صنس کا جویاں ہے۔ انسان اپنے خندہ برمحل سے لے کر گریۂ مصنوعی تک ہر حالت میں ایک شریک جذبات کا خواہاں ہے۔ اور اس حماقتِ صحبت کی تہ میں حیاتِ انسانی کے اہم راز مضمر ہیں۔ اس میلان معاشرت کو سلب کر لیا جائے تو انسان غالباً ارذل المخلوقات بھی نہیں رہ جاتا۔

خوشگوار لطفِ صحبت اور مناسبتِ طبیعت۔ دوستی کا عنوان ثابت ہوتی ہے۔ انسان ایک دوست یا مساعدت زمانہ کے بدولت ایک درجن دوست مہیا کر لیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے مسرت حیات کو پا لیا۔ مگر فی الحقیقت ایسے احباب کے تعلقات تارِ عنکبوت سے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ حوادث روزگار کا ایک طمانچہ۔ فلک کج رفتار کی ایک گردش۔ تمام دائرہ احباب کو ایک دن میں منتشر کر دیتی ہے۔ ایک ایران میں نظر آتا ہے تو ایک طوران میں۔ ایک کسب معاش کے جنون میں مبتلا ہو کر آوارہ گردی اختیار کر لیتا ہے تو ایک دو عدد موہنی آنکھوں کا شکار ہو کر زاویہ خانہ سازی میں مقید ہو جاتا ہے۔ یہ ہر صورت شیرازہ صحبت درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس ناگزیر امکان تفرقہ کا علاج۔ بالکل علاجِ بالمثل ازدواج ہے۔ انسان شادی کے زیر سایہ۔ کم سے کم ایک۔ اور زیادہ سے زیادہ بقدر ہمت۔ ایسا مونس مہیا کر لیتا ہے جس کے تعلقات صحبت بادِ حوادث کے معمولی جھونکوں سے پراگندہ نہ ہو سکیں۔ بلکہ ایک اور ایک کے دوش بدوش اجتماع سے گیارہ ہوتے رہیں۔ یہ ہے فلسفہ ازدواج کی ساری کائنات

افزائش انسانی بھی ایک مقصدِ ازدواج کہا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ مقصدِ ازدواج سمجھے جانے کے محض ناگزیر نتیجۂ ازدواج ہو سکتا ہے! افزائش نسل نر و مادہ کے اتصال پر مبنی ہو۔ مگر ایسے اتصالِ عارضی کے لئے کسی مستقل بندشِ تعلقات کی حاجت نہیں۔ اس کے علاوہ نوّے فی صدی افرادِ ازدواج مائل کے کسی گوشۂ دماغ میں افزائش نسل کا مقصد شادی کا بیڑا اٹھانے کے وقت موجود نہیں ہوتا اور بہ فرضِ محال دس فیصدی الفادہ کے دل میں ہوتا ہو تو وہ "مردمی کے آرکیس۔ اور آلۂ "ایکڑس" کے ممنونِ منّت ہونے پر بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے —— شادی فی الحقیقت ایک ایسے ہم جنس کی تلاش ہے جو ہر پھونک کے ساتھ اڑ نہ جائے۔ ممکن ہے کہ یہ استواریٔ تعلق ہی بعض اوقات تپ دق کے مرادف ثابت ہو جائے۔ غالباً اسی مصیبت ناگوار کے تلخ تجربے نے حکیم شیرازؒ کو۔ زنِ نو کُن اے یار در ہر بہار کا مشورہ دینے پر اور تقویم پارینہ کی کینچلی بدلتے رہنے کا عمل بتانے پر آمادہ کیا

دو ہستیاں اگر کچھ مدّت کے لئے ایک پاگل خانہ میں بند کر دی جائیں، دو متنفس کسی غیر آباد جزیرہ کے کنارہ جا لگیں، تو مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ کلام و خیالات پر مجبور ہو گا۔ ایک دوسرے کے مزاج، میلان پسند و نفرت اور کیفیتِ جذبات سے روز بروز واقف ہوتا جائے گا اور یہ واقفیت باہم تعلقاتِ صحبت میں استواری پیدا کرنے لگے گی۔ رفتہ رفتہ دو اجنبی ہستیاں جامع المتفرقین کے وضع کردہ قانونِ نفسیات کی بدولت ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں گی اور یہ پیوستگی اس درجہ پختہ ہو جائے گی کہ موت کے سوائے کوئی دوسری چیز

تفرقہ انداز نہ ہو سکے گی - اس لحاظ سے شادی دوئی کو وحدت میں بدلنے کی پہلی مشق نظر آتی ہے

تاہم ازدواج کامیاب ثابت ہونے پر بھی کوئی بہادرانہ فعل نہیں - اس کے بدولت فیاض طبع اور آزاد دماغ، بخیل و تنگ خیال ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے - شادی شدہ مرد - کاہل، خوشامد پسند اور خود غرض ہو جاتا ہے اور یہ خود غرضی اس درجہ دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہے کہ خود زوجہ کی ہستی بھی اس کا شکار ہونے سے نہیں بچتی - شادی شدہ مرد کے شریفانہ جذبات پر خانہ داری کی موٹی چربی کی تہ چڑھ جاتی ہے اور گھر کے نت نئے قضیئے تمام جولانی طبع کو سرد کر دیتے ہیں - ایک منچلا نوجوان جو شادی سے پیشتر اظہار شجاعت وارتکاب جرائم کے لئے یکساں طور پر موزوں تھا. دس برس گھر کے چولھے کی دھیمی آنچ پر دم پخت ہونے کے بعد سوائے مکھیاں مارنے کے اور کسی مصرف کا نہیں رہتا، آزادہ رو دماغ اس بندِ حیات سے حتی الامکان گریزاں رہنا اور عمر خیام، حافظ اور محبوبؒ الٰہی (دہلوی) کی تقلید کرنا پسند کرتے ہیں - ایسے گروہ کا اگر کوئی فرد، اگر فریب ہستی کا شکار ہو کر، ازدواج کی حماقت میں مبتلا بھی ہو جاتا ہے تو اس کا حشر سعدی یا غالب کے مانند ہوتا ہے اور بالآخر وہ چیخ اٹھتا ہے کہ

بہ آدم زن، بہ شیطاں طوقِ لعنت   سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم   گراں تر آمد از طوق عزازیل

مجھے واقعی حیرت ہوتی ہے کہ تمام دنیا میں عموماً اور مغربی دنیا میں خصوصاً طلاق و علیحدگی کے اعداد اس قدر کم کیوں نظر آتے ہیں ؟ - کہا جاتا ہے کہ اس

کی وجہ محبت ہی ـــــــ حاشا وکلا میں اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں
میں حسین صورتوں کو کریہ النظر انفار کے قبضہ میں پاتا ہوں، خوش رو
جوانوں کو چڑیلوں کے سائے میں دیکھتا ہوں۔ بڈھوں کی آغوش میں ناشگفتہ
غنچے نظر آتے ہیں اور نوجوانوں کی بغل میں جوانی سے ڈھلکی ہوئی ہستیاں دیکھنے
میں آتی ہیں ـــــــ کیا ایسے کورانہ عمل کو جو اتفاقاتِ زمانہ اور سیلاب
معاشرت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ محبت کا نتیجہ سمجھوں؟ ـــــــ آپ کو
اختیار رہے لفظ محبّت کے ساتھ اصطلاحی اور لغوی رنگ میں ظلم کیجئے۔ اُس
کے نت نئے مفہوم تراشئے اور اس کے گلوئے نازک پر اپنی خانہ داری کی کُند
چُھری پھیر دیجئے ـــــــ مگر ـــــــ میں بذاتِ خود محبّت کو اس تلاطم حیوانیت
سے بدرجہا بلند سمجھتا ہوں ـــــــ کیوپڈ کے زرّیں تیر اور وینس کی حسن پاشیاں
بے حس اور روزگاری دنیا کی کورانہ معاشرت کے سرصدقے نہیں ہو سکتے ـــــــ
یہ خیال غلط ہے تو یقیناً ازل سے آج تک تمام شعراء، مغنّی اور نقاش دنیا کو
اپنی آبلہ فریبی کا شکار بناتے رہے

شیر واقعی چوپایہ حیوانات کا بادشاہ ہی مگر اس میں پالتو جانور بن جانے کی صلاحیت
مطلق نہیں۔ اس اعتبار سے وہ انسانی دائرۂ ضروریات کے لئے گھوڑے اور
کُتّے سے مقابلتاً ناکارہ ہی ـــــــ اسی طرح ـــــــ محبّت سرتاج جذبات ہی مگر وہ
خانہ داری کی سرد و مرطوب فضا کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بادۂ کہنہ ہو یا معتقداتِ
مذہب، نغمۂ ہوش رُبا ہو یا جذبۂ محبّت، ان میں سے ہر ایک معمول کے جوہر و عیوب
یکساں طور پر نمایاں کر دیتا ہی۔ اس کے عمل سے ایک متحیّر و متحمّل ہو جاتا ہی تو ایک

تند و فریادی، ایک ہمہ تن تبسّم بن جاتا ہے تو ایک سرتاپا گریہ، ایک ہمدرد ایثار پسند ہو جاتا ہے تو ایک غضب ناک حاسد ــــ متضاد نتائج کا دار و مدار معمول کی ذاتی فطرت سے تعلق رکھتا ہے۔ جذبہ شریف کے عمل کو کسی طرح مورد الزام نہیں بنایا جا سکتا ــــ بہرحال، ایسا تند و تیز جذبہ خانہ داری کی خاموش زندگی کے لئے اکثر ناموزوں ہی ثابت ہوگا ــــ بے نظیر تھی وہ شخصیت (صلوٰ علیہ وآلہ) جس نے تعلّق ازدواج کو محض معاہدۂ حیات و معاشرت بنا کر تمام لغو و مفروضہ طلسم محبّت کو یک قلم باطل کر دیا

طلسم محبّت کے باطل ہونے کے بعد ازدواج کا دار و مدار صرف ذاتی معیار انتخاب پر رہ جاتا ہے اور معیار انتخاب کے متعلق کوئی جامع و مانع اصول نہیں ظاہری و جسمانی امور سے لے کر باطنی و قلبی کیفیات تک کوئی خاص بات یا عادت ایسی نہیں جس کو متفقہ طور پر خوبی اور باعث پسندیدگی مانا جاتا ہو۔ مونس حیات کا انتخاب بظاہر "جتنے مُنہ اُتنی ہی باتیں" نظر آتا ہے مجھے اس مسئلہ کی بابت ہر طبقہ کے افراد سے تبادلۂ خیالات کا تھوڑا سا موقع میسّر آچکا ہے۔ مذہب کے معتقدین، تعلیم جدید کے مقلّدین، متموّل افراد، متوسط اصحاب، کاشتکار و سوداگر، ــــ ہر شخص سے گفتگو کر چکنے کے بعد میں اُن کے نقطۂ انتخاب کے متعلق صرف اس قدر سمجھ سکا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھ سکا

ایک عورت کی رائے ہے:۔ عورت حسین ہو مگر حُسن پرست نہ ہو۔ عالی دماغ ہو مگر دماغ دار نہ ہو۔ مزاج داں ہو مگر مزاج دار نہ ہو۔ بہترین شریکِ عیش ہو مگر عیاش نہ ہو۔ اور صحبت یافتہ ہو مگر صحبت پسند نہ ہو۔

دوسرے کی رائے میں :- عورت عقلمند ہو مگر نیک و بد میں تمیز نہ کر سکے تعلیم یافتہ ہو مگر شوہر کی تعلیم پر مائل نہ ہو- پردہ سے آزاد ہو مگر سیلک اسٹیج کی تیلی نہ ہو- تعلیم نسواں کی حامی ہو مگر مرد کی جہالت کو ہمیشہ نظر انداز کر سکے اور بہر صورت مشغلۂ شباب ہو- مگر ہر سال ایک بچّہ وجود میں لانے کی عادتِ قبیحہ کا شکار نہ ہو-

تیسرے کی رائے میں - عورت بُردبار ہو، جفاکش ہو، کم سخن ہو - اور خانہ دار ہو-

اکثر کی رائے میں :- عورت کچھ بھی ہو مگر زردار ہو-

واقعہ یہ ہے کہ "ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد" اور اس ذاتی خبط پر نقطۂ انتخاب کا دارومدار ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سرِ شام سے سو جانے والی اور علی الصباح اٹھ بیٹھنے والی عورت بھی ایک مصیبت ہے- اسی طرح بچّہ کش ہونے کی صلاحیت میں دومٹ نمبر اوّل کی حد تک پہنچ جانے والی عورت بھی ایک ناقابلِ برداشت آفت - یا گھر کی چہار دیواری کے لئے نمونۂ قحط - مگر یہاں بھی مجھے اقبال کرنا پڑتا ہے کہ میرے اُدلی اور سائیس کو مجھ سے اتفاق نہیں وہ مفلسی میں بھی برخورداری کے قائل ہیں —— سچ یہ ہے کہ "توفیق بہ اندازۂ ہمّت ہے ازل سے"! مجھے افسوس ہے کہ جنس لطیف کی ترجمانی خیال کی عزت مجھے حاصل نہیں - تاہم اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عورت اکثر و بیشتر مرد کو باربردار اور خدمت گزار چاہتی ہے اور غالباً ایسے مرد کو مشکل سے پسند کرے گی جو اور کچھ نہیں تو حقّہ بھی نہ پیتا ہو- اس افراط و تفریط کا مقطع —— اصول موضوعہ کی اہمیت رکھنے والا

مقدّر —— اگر ہے تو اس قدر کہ مرد کی رائے میں عورت بہر حیثیت عورت ہو
اور عورت کی رائے میں مرد بہر لحاظ مرد ہو —— اور بس
ذاتی پسند و نفرت کی تشریح پر گمان ہو سکتا ہے کہ طلاق علیحدگی کے
اعداد کی کمی بھی غالباً اسی پر مبنی ہے۔ یعنی بالعموم ہر شخص اپنے خبط کے مطابق
اپنا مونس حیات پا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے علیحدگی کے واقعات بہت کم
رونما ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت اس نتیجہ سے کوسوں دور ہے۔ میں خود اپنے علم
میں اس کے برخلاف تجربات کی شہادتِ حلفی دے سکتا ہوں۔ اگر تہتک
اور ازالۂ حیثیت عرفی کا خوف دامن گیر نہ ہو تو ایسی درجنوں مثالیں نام بہ نام
گنائی جا سکتی ہیں۔ جو نتیجہ مذکورہ کی پوست کنی پورے طور پر کر دیں۔ مجھے
ایسے احباب کے مطالعۂ حیات کا فخر حاصل ہے جو ایک زمانہ تک نہایت
پیاری اور دلکش صحبتوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہے اور کبھی اُن کے دامِ
تزویر میں مستقل طور پر نہ پھنسے، لیکن بالآخر، قطعی خلاف توقع، ایک
نسبتاً کریہ صورت و کم پایہ شخصیت سے ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے۔ واقعہ
یہ ہے کہ تعلّق ازدواج کی کامیابی حسب پسند نمونہ میسّر آجانے پر مبنی نہیں۔
بلکہ یہ بھی حاجتمند کی اندرونی کیفیت کا کرشمہ ہے۔ شادی کی کامیابی
فی الحقیقت شادی کرنے والے کی رُجحانِ پژمردگی پر مبنی ہے۔ انسان
جس وقت صرف ایک ہستی کے ساتھ گزارنے کی ٹھان لے، پھر وہ ہر طوق
کو زیبِ گلو بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے، اور طوق کی خوبصورتی یا بدصورتی
کو اس کامیابی میں قطعی دخل نہیں ہوتا۔

طلسمِ ازدواج

فی الحقیقت ازدواج کی بنیاد کسی چیز پر بھی ہو۔ مگر یقیناً محبت پر نہیں سمجھی جا سکتی ممکن ہے کہ آپ ایک خوشرنگ گلاب کے رنگ و بو سے دفعتاً گرویدہ ہو کر توڑ لیں اور اپنے کالر کے کاج میں اُسے زیب تن فرمائیں لیکن اس شغل اضطراری کو محبت سمجھنا آبلہ فریبی سے کم نہ ہوگا۔ اُس خوش رنگ پھول میں استعمال و مدّت کے بدولت پژمردگی کے آثار شروع ہوئے کہ آپ نے اُسے اپنے کوٹ کالر سے نکال پھینکا، فی الحقیقت پژمردہ پھولوں کو مردہ اجسام کے مرقد بھی برداشت نہیں کرتے۔ اس خود غرضی و ہوس کاری کو محبّت سمجھنا کم از کم میرے دماغ سے بالاتر ہے۔

ازدواج کی کامیابی کا دارومدار محض فریقین کے اختلاطِ جذبات و میلانِ پژمردگی پر ہے۔ آپ اشتہائے صادق کی عدم موجودگی میں بہتر سے بہتر غذا تناول فرما کر بھی اچھے نتیجہ کی امید نہیں کر سکتے، اور کلیجہ مسوس لینے والی بھوک کے عالم میں پتھر بھی ہضم کر جانے کو تیار ہونگے اسی طرح جب تک آپ اس درجہ بیں ہمّت و کاہل وجود نہ ہو جائیں کہ کہ ساری دنیا کا وجود اپنی چہار دیواری میں فرض کر سکیں، آپ ایک حور کے ساتھ عرصہ دراز تک نہیں رہ سکتے البتہ میلان پژمردگی اور آثار زکان پیدا ہو جانے کے بعد، آپ کسی عورت کے ساتھ بخوبی نتھی کئے جا سکتے ہیں میلان ازدواج صحیح طور پر اسی وقت سے محسوس ہونا شروع ہوتا ہے جب سے حُسن پرستی کی صلاحیت زائل ہونے لگتی ہے۔ مائل بہ ازدواج شخص بالکل ایسا آدمی ہے جو کورنگ یعنی کلر بلائنڈ ہو۔ ایسے شخص سے

رنگ و روغن کی داد چاہنا یقیناً خلاف عقل ہو گا۔

تخیلاتِ مذکورہ، اگر ناظرین کو مسرور کر سکیں تو فبہا۔ ورنہ میرے خیال میں وہ اسی وقت زیادہ دلچسپ نظر آ سکتے ہیں۔ جب آپ اُن سے حرف بحرف مخالفت کریں۔ بہرحال وہ کسی صورت میں ضرر رساں ثابت نہ ہونگے کیونکہ مجھے یقین کامل ہے کہ ایک فرد واحد بھی ان پر عمل نہ کرے گا۔

بایں ہمہ اس میں شک نہیں کہ موت کیسی ہی ہولناک چیز ہو، ایک نہ ایک دن آکر رہے گی اور ازدواج کیسا ہی کمزور طلسم کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک دن آپ کو پھانس کر مانے گا۔ فی الحقیقت ازدواج ایک محصور قلعہ کے مانند ہے۔ باہر والے اندر گھسنے کے لئے خون پانی ایک کر دیتے ہیں اور اندر والے باہر نکلنے کے لئے رات دن گھڑیاں گنا کرتے ہیں۔



مسٹر ابلیس

مسٹر ابلیس[1]

نمبر ا

وہ شیطان علیہ اللعن نہیں جو پرانے زمانہ میں لاحول کے دُرّوں سے دُم دبائے گوشہ گوشہ میں چھپتا پھرتا تھا، جو اکثر منڈے ہوئے سر، دراز ریش اور اُٹنگے پائجامہ کے ساتھ تقدّس کا روپ بھرے ہوئے مسجد کے ملّانوں کے دل میں رات کی روٹی کی فکر پیدا کر کے نمازِ عشا کا خیال بھلا دیتا تھا؛ نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ ابلیس جو نہایت کامیابی اور عیش کے ساتھ گذار رہا تھا، جو ہر سوسائٹی میں بلا روک ٹوک شامل ہوا کرتا تھا اور جو آئے دن نت نئی رنگتیں بدل کر اپنے حلقۂ کامیابی اور دائرہ فتح کو بڑھاتا جاتا تھا!

عقل کا فرشتہ کہتا ہے کہ یہ ابلیس ہشتادم ہے؛ اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ قدرت کا واضع قوانین زمانہ کی رفتار اور ضروریات کو دیکھ کر، کم وبیش ہر صدی میں، ایک نئے ابلیس کے ہاتھ میں عنانِ شیطنت دیتا رہتا ہے۔ اس کی عمر، اور اس کی صورت؟ کچھ نہیں، اور سب کچھ۔ وہ اپنی قوّتِ ابلیسی سے تماشبین قدرت کی طرف سے عطا ہونے والی قوّتِ ابلیسی سے، آنِ واحد

---

[1] مطبوعہ مخزن جولائی سنہ ۱۹۱۱ء۔

میں، جس صورت اور جس سن کا چاہے نظر آسکتا ہے!

مسٹر ابلیس نے۔ ابلیس ہشتادم نے جو اپنا نام بغیر مسٹر کے استعمال کئے جانے کو سخت ہتک سمجھتا تھا۔ اپنی توجہ، بیشمار ذریات کی طرف۔ دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ذریات الشیاطین کی طرف۔ مائل کی؛ آناً فاناً؛ آنکھ بند کرتے ہی اُسے اپنی قوت پر تلبیس کی مدد سے۔ وائرلس، ٹیلیگرافی، شعاعِ نور و برقِ تاباں، بادِ صرصر و تخیلِ دماغی، ان سب سے بدرجہا تیز اور سریع السیر قوت کی مدد سے معلوم ہو گیا کہ اُس کی ذریات ایسا مشکل کام عقل رکھنے والے انسان کی آنکھ میں اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا دکھانے کا مشکل کام۔ نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ یہ دیکھ کر اُسے جس قدر فرحت اور جس درجہ مسرت، ہوئی اس کا اندازہ یا تو وہی بازیچۂ اطفال کا تماشہ دیکھنے والے کارپردازانِ قدرت کر سکتے ہیں یا خود مسٹر ابلیس کا جولان گاہِ خباثت دل اچھی طرح جانتا ہو گا!

مسٹر ابلیس کی موجودہ کامیابی مسلّم؛ اس کی روز افزوں ترقی تسلیم شدہ؛ لیکن اس کارخانۂ دنیا کے فانی ہونے کا خیال، ایک ناقابلِ بیان خلش پیدا کرنے والا کانٹا تھا جو رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا۔ یہ ہی بے چین کرنے والا خیال ہر موقعۂ مسرت پر۔ دامِ تزویر میں کسی نئے شکار کے پھنس جانے سے پیدا ہونے والی عارضی مسرت کے موقعہ پر۔ مسٹر ابلیس کے دل و دماغ کے ساتھ۔ مسکنِ شیطنت دل و دماغ کے ساتھ۔ قدرت کے زور دار اور بے پناہ طمانچۂ غیبی کا کام کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی خوش ہوتے ہوتے، دفعتاً وہی خیال۔ اس تمام

کائنات کے ایک نہ ایک دن درہم برہم ہو جانے کا خیال۔ مسٹر ابلیس کے نخلِ مسرت و کامیابی پر بجلی کی طرح گرا، اور وہ چونک پڑا۔ تھرا گیا، اور کانپ اٹھا..

اس غیر معمولی اور اچانک خلش کا فوری علاج، حسبِ معمول اس نے سامنے رکھی ہوئی بوتل سے۔ ہاؤس آف لارڈ کے لیبل والی سیاہ بوتل سے کیا۔ آتشِ سیّال کے ایک کناروں تک بھرے ہوئے گلاس نے اس کے دفعتہً پژمردہ ہو جانے والے دماغ کو پھر از سرِ نو مشتعل کر کے نمونۂ دوزخ بنا دیا اور وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا ؎

اب تو آرام سے گذرتی ہے،

عاقبت کی خبر..........،،

بس صرف اسی حرف پر پہونچ کر وہ خاموش ہو گیا! کیونکہ وہ اُس کے بعد کا حرف قادرِ مطلق کا نام جس کی ایک صفت قہّار بھی ہے وہ اپنی زبان سے نکالنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

فوراً اُسے کسی خاص کام کا۔ کسی پہلے سے سوچی ہوئی شیطنت کا۔ خیال آیا؛ وہ کھڑا ہو گیا اور چلنے کی تیاری کرنے لگا. سب سے پہلے اُس نے اپنے طوقِ لعنت کو جو آٹھ ہزار برس سے یکے بعد دیگرے ہر فرماں روائے شیطنت کے گلے کا ہار ہوتا آتا ہے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا؛ اپنے متقدمین کی طرح اونی گلوبند یا شالی رومال باندھ کر نہیں چھپایا، بلکہ چمک دار سفید برّاق ڈبل کالر لگا کر چھپایا: پھر سر سے پاؤں تک انگریزی لباس پہنا اور نکل کھڑا ہوا۔

اب وہ ہندوستان کے مشہور شہر .... کے ایک بازار میں جا رہا تھا۔

ایک خوبصورت ہلکی پھلکی کیمبر ولیٹ جیسے ایک سرنگ عرب اڑائے لئے جاتا تھا۔ اس کے پاس سے گذری؛ اس میں ایک جوان آدمی اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے اور ہیٹ لگائے، ریں ہاتھ میں لئے نہایت تمکنت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مسٹر ابلیس نے پہلی ہی نظر میں معلوم کر لیا کہ یہ حضرت کوئی جج صاحب تھے؛ لیکن اس نے کچھ زیادہ التفات نہیں کیا؛ کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ ان حضرت پر ایک دیو خبیث مسٹر ابلیس کی ذریات میں سے ایک خاص پلید۔ پہلے ہی سے مسلّط تھا۔ ایسے مغرور حضرات کو وہ اپنا خاص الخاص، تابعِ قوت پُر تلبیس سمجھتا تھا۔ گروہ کے گروہ، کوئی بگی میں، کوئی گھوڑے پر، کوئی موٹر میں کوئی بائیسکل پر، اس بھرے پُرے شہر کے بازار میں اس کے پاس سے گذر رہے تھے اور کوئی فرد بشر اس کی ذریات کے حلقۂ تزویر اور دائرۂ فریب سے باہر نہیں آتا تھا! اس لئے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود تکلیف گوارا کرتا، اور جو پہلے ہی سے اس کے ادنیٰ کارپردازانِ شیطنت کے آگے گردن جھکائے ہوئے تھے، ان پر کوئی سِتا چلاتا یا ان کو رام کرنے کی کوشش کرتا!

مسٹر ابلیس سگار کے دھوئیں سے ہوا میں چھلے بناتا، برابر آگے بڑھے جا رہا تھا اور اپنے معائنہ میں۔ اپنی ذریات کے اہم اور ذمہ داری کے کام کے معائنہ میں۔ مصروف تھا: یہ اس کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ وہ اسی طرح گشت لگاتا اور جہاں کہیں اپنے ماتحتوں کو۔ اپنی قوت تلبیسیہ کی عملی مشین کے چلتے پُرزوں کو غلطی کرتے یا کاہلی میں مبتلا، بلکہ یوں کہئے کہ، غلطی سرزد کرانے

میں ناکامیاب یا کاہلی پیدا کرنے میں سُست ۔ پاتا، تو فوراً اصلاح کر دیتا ۔ ڈانٹ دیتا اور تاکید کر دیتا ۔

یوں تو دنیا کا ہر نیک نہاد شخص بالعموم مسٹر ابلیس کا مدّمقابل؛ اور مسٹر ابلیس اس کے پھانسنے یا آزار دینے کے درپے ۔ لیکن جو بُغض اور دشمنی مسٹر ابلیس کو بالخصوص مسلمانوں سے تھی وہ حد سے بھی تجاوز کر گئی تھی؛ اور کیوں نہ تجاوز کر جاتی، جب کہ وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں اس کے متقدمین کو ۔ گزشتہ فرمانفرمایانِ خباثت کو مع اپنی بیشمار لشکر ذریات کے فاش شکستیں ہوئی تھیں، اور صدیوں تحت الثریٰ تک بھی گوشۂ عافیت و اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا ۔ مگر ایک عرصۂ دراز سے وہ اس طرف سے بھی مطمئن تھا: اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو ۔ موجودہ مسلمانوں کو ۔ اُس نے اور اس کی ذرّیات نے، ایک ایسی ناگفتہ بہ حالت تک پہونچا دیا تھا کہ وہ گردن جھکائے، آنکھیں بند کئے، پستی کے غار کی طرف بڑھے جاتے تھے ۔

اب پھر ایک موٹر ابلیس کے پاس سے گذری : اس میں دو تین ہندوستانی عورتیں جلوہ افروز تھیں؛ جن میں غالباً دو ہندو، ایک یہودی، اور ایک مسلمان تھی !! یہودی لڑکی بقیہ تین سے عمر میں کم مگر حسن میں بدرجہا زیادہ تھی ۔ یہ موٹر کچھ آگے بڑھ کر ایک دوکان کے سامنے رُکی اور مسٹر ابلیس بھی فوراً اس کے پاس پہونچ کر ٹھٹک گئے ۔ یہ سب کی سب کچھ سامان دیکھنے بھالنے میں مصروف تھیں، اور تمام راہ گیر جو پاس سے گذرتے اُن کے دیکھنے کے لئے ٹھہر جاتے تھے ۔

کیوں ٹھہر جاتے تھے ؟ اس لئے کہ کمسن یہودی لڑکی ۔ شعلۂ جوّالہ یا برقِ بلا

اپنے تبسّم زیرلب سے ، غنچہ ناشگفتہ کی تصویر کھینچ رہی تھی : اس کی سیاہ اور کمر تک پہونچ کر ہوا میں لہرانے والی زلفِ دراز ۔ عمر تسلسل اور لیلۃ القدر اپنے پیچ وتاب سے ۔ مرگ سنبل کی خبر دے رہی تھی : اُس کی شوخ اور چمکتی ہوئی آنکھیں ، اپنی نگاہوں سے ۔ مست اور سرشار نگاہوں سے عقل و ہوش کے فرشتہ کو فنا فی العشق کا چھلکتا ہوا جام پلا رہی تھیں : اس کی پیوستہ اور گنجان بھنویں خنجر آبدار و کمان سخت ۔ مژگانِ خمیدہ کی مدد سے ۔ خدنگ قضا ہیں تقدیر کی مدد سے ۔ مرغِ تدبیر کا دل نہایت آسانی کے ساتھ اُچک لیتی تھیں ۔ مختصر یہ کہ وہ کمسن نازنین اپنی خوبصورت ناک سے ۔ چشمۂ نور کی موج سے ؛ اپنے نازک ہونٹوں سے ۔ آب حیواں کے مُنہ میں پانی بھر لانے والے ہونٹوں سے ؛ اپنے صاف اور سُرخ رخساروں سے ۔ رشک وہ حور و غلماں گلاب کی پنکھڑیوں سے ؛ اپنی نازک اور تنگ کمر سے ۔ تکلیف دست اندازیٔ شوق کی زندہ تصویر سے اور سب کے آخر میں مگر سب سے زیادہ ۔ اپنے علاج قوّت بصارت سے ؛ دیکھنے والوں کے دل پر ، اور دل سے زیادہ ایمان پر ، وہ وہ بجلیاں گرا رہی تھی کہ مسٹر ابلیس خوشی کے مارے آپے سے بے آپے ہوئے جاتے تھے مسٹر ابلیس کو ایک حسین کمسن لڑکی سے جو بے پردگی کی زندگی بسر کر رہی ہو جو اپنے حسنِ زاہد فریب سے نوجوان طبیعتوں کے دل میں شعلۂ جہنم مشتعل کر دیتی ہو ۔ خواہشاتِ بد اور شرورِ نفس کی بعید امید تھی ۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خاندان ابلیسیہ کے بانی نے ملعون اوّل نے ۔ اپنے انتقام کی آگ کا شکار ، ایک عورت ہی کے ذریعہ سے ، آدم کو بنایا تھا ۔

وہ نہایت خوش ہوتا تھا، اس کی قوتِ تلبیس جوشِ مسرت میں کرۂ نازبن جاتی تھی۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ بے پردگی کی وُبا مسلمانوں میں بھی پھیل رہی ہے۔ کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس خنجر عصمت کُش کے سامنے اسلام کا طبقۂ نسواں۔ دام تزویر اور بدکاری کے جال میں کبھی نہ پھنسنے والا طبقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی راستبازی اور نیک نیتی کے ہتیار ڈال دے گا اور اپنے مردوں کو مسٹر ابلیس کا شکار بنانے میں قوتِ مقناطیسی اور کششِ اجسام کا کام دے گا۔۔

موٹر چلا اور وہ کیوپڈ کی نورِ نظر یہودی لڑکی جو قامتِ دلنواز میں قیامت سے بھی ایک قدِ آدم زیادہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں کی نظروں سے حُسن عالم گیر کی شمع پر گرنے والے انسانی پروانوں کی نظروں سے۔ ہلال عید کی طرح غائب ہوگئی: مسٹر ابلیس اس حُسن گلوسوز کے اثرِ بد کا اندازہ کرتا ہوا، پردہ کے خیال میں منہمک، چل نکلا! پردہ اور بے پردگی کا مقابلہ کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ سب سے پہلے اُسے پردہ کے رواج کی بیخ کنی کرنی لازمی ہے: اس نے طے کرلیا کہ وہ طبقۂ نسواں کے متعلق، اپنی ذُرّیات کی تمام کوششیں پردہ کے برباد کرنے پر عصمت آباد کی مضبوط فصیل منہدم کرنے پر۔ لگادیگا، اور ضرور لگا دے گا۔۔

اب وہ ایک کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا تھا، اوپر کے کمرے میں سے گانے اور ساز کی آواز آرہی تھی! مسٹر ابلیس نے یہاں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا یہ فرقہ۔ تمام خوبیوں کو خواہشاتِ نفسانی اور مبلغ علیہ السّلام پر قربان کردینے والا فرقہ۔ مسٹر ابلیس کا موردِ عنایاتِ خاص تھا۔ صرف یہی وہ گروہ

تھا جس کے توکل الی الشیطان پیشہ کا کام۔ غارتگری اور تباہی کا کام۔ سالانہ رپورٹ میں، مسٹر ابلیس کی تمام ذرّیات کے پر تلبیس کامیابی کے برابر نظر آیا کرتا تھا! وہ آگے بڑھے گیا اور گانے کی قوّت سامعہ کے ذریعہ سے دل و دماغ کو بندۂ جذباتِ نفس بنانے والے جادو کی۔ سُریلی اور دل کش آواز برابر آتی رہی: فوراً مسٹر ابلیس نے کسی عمدہ شعر پر جو ہوا میں گونج کر اس کے کان تک پہونچا تھا۔ ”مرحبا! آفریں۔ صد آفریں۔ بیساختہ کہا۔

شعر نہایت عمدہ تھا، اور مسٹر ابلیس اپنی خبث بھری طبیعت اور پُر فن دماغ کے زور سے اُس شعر کے ایسے معنی تراشتا تھا جو شعر کے مصنّف کو۔ شاعرِ مرحوم کو اگر سنائے جاتے تو غالباً وہ تمام عمر کے لئے شاعری سے دست کش ہو جاتا۔ جو کچھ بھی ہو ا مسٹر ابلیس اس شعر کو بیحد پسند کرتا تھا، اور اب۔ جب کہ وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، جب گانے کی دلکش آواز اُس کے کانوں تک نہیں پہونچتی تھی۔ اُس نے وُہی شعر، شوق تلبیس اور اشاعتِ الحاد کے جوش میں خود گنگنانا شروع کردیا......

”ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے“



مُعمّا

مُعمّا[1]

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمّا را

رات کے تین بج چکے تھے کہ میری آنکھ کھلی۔ میں اس روز زیادہ تھک جانے کی وجہ سے سرِ شام ہی سے سو گیا۔ اور اسی وجہ سے تین بجے کے بعد میری نیند بھر گئی تھی اور اب میں ہوشیار تھا۔ اس کا جواب میں شاید کافی طور پر نہیں دے سکتا کہ میری آنکھ خود بخود کیوں کھلی؟ کیوں کہ دن چڑھے تک خرّاٹے لینے والی مخلوق اس بات کو مشکل سے تسلیم کریگی کہ میرا جسم و دماغ جس قدر آرام لینے کا روزانہ عادی تھ وہ اُسے ل چکا تھا اور اب وہ پھر دنیا کی کش مکش میں مبتلا ہونے کے لئے تازہ دم تھا۔

چاندنی نہایت چمکتی، صاف و شفاف چٹکی ہوئی تھی، چاروں طرف ایک سکوت طاری تھا، میرے دماغ کی کارگزاری کے لئے اچھا موقعہ تھا اور میں ہمہ تن قوتِ متخیلہ کا تھوڑے دیر کے لئے تابع ہو گیا تھا۔ جو کتاب دیکھتے دیکھتے میں سو یا تھا۔ اور جس کی اُلجھن میں رات بھ

---

[1] مطبوعہ تمدّن جنوری سنہ ۱۹۱۴ء۔

طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا وہ اس وقت بھی سرہانے رکھی ہوئی تھی - اور سچ پوچھئے تو وہی خیال اس وقت بھی "چو میرد مبتلا میرد - چو خیزد مبتلا خیزد" کی مثال بنا ہوا تھا دماغ میں موجود تھا!

یہ کتاب کیا تھی؟ مولانائے روم ؒ کی مثنوی - اور یہ خیال کیا تھا؟ تصوّف کی اُدھیڑ بن - اس میں کوئی شک نہیں کہ سچ ہر حالت میں سچ ہے - اگر آپ اس کو جانتے اور سمجھتے ہیں تو بھی سچ ہے؛ اور اگر آپ اس کو اپنی لاعلمی یا کوتاہ بینی کی وجہ سے نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے تو بھی سچ ہے؛ وہ دنیا پر حکومت کرتا رہتا ہے عام اس سے کہ آپ اُس حکومت کو دیکھ رہے ہیں یا نہیں؛ قوانینِ قدرت ہمیشہ سے دنیا پر حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں - اس سے پیشتر بھی جب کہ انسان نے ان کو دریافت کیا اور سمجھا وہ اسی طرح حکمراں تھے جس طرح اب ہیں - قانونِ کششِ زمین سر آئزک نیوٹن کے کھوج لگانے اور دنیا کے پوری طرح اس سے واقف ہونے سے پیشتر بھی ایسا ہی تھا جیسا اب ہے - ہمارے جاننے یا نہ جاننے سے اس کی سچائی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا؛ ایک بیش بہا درخشاں الماس معدن کے پردے میں ہماری لاعلمی یا ناواقفیت سے اس کی درخشانی اور قیمت میں مطلق بھی کمی نہیں ہو سکتی؛ اصلیت کے لحاظ سے - ہیرا بازار میں بھی وہی ہے جو معدن میں تھا، ہماری نگاہ کے سامنے بھی ویسا ہی ہے جیسا ہماری نگاہ سے پوشیدگی میں تھا؛ کوئی سچی بات جو سائنس اور فلاسفی کی

دسترس سے باہر ہو یا جہاں تک ابھی اس کا بلند پرواز دماغ نہ پہونچا ہو کسی طرح لغو و مہمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ میری دماغی الجھن یا کشمکش اس کائنات کے وجود کی نسبت تھی جو تمام موجودہ تحقیقات و ایجادات کے بعد، آج بھی ویسا ہی معمّہ ہے جیسا آج سے دو ہزار برس پیشتر تھا۔

اس معمے کو دنیا نے اگر بلحاظِ مذہب تقسیم کیا جائے تو ۲ دو طریقہ سے حل کیا ہے۔ اوّل مذہب کے عقیدے سے، اور دوئم فلسفہ اور سائنس وغیرہ کی تحقیقات و تجربوں سے۔ آخرالذکر کی ساری عمارت عقل پر چُنی گئی ہے اس لئے دماغ انسانی کا اس کو زیادہ قرینِ قیاس سمجھنا ایک حد تک بجا ہے۔ میں بھی عام راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا؛ میرا طائرِ خیال بھی فضائے اثیر میں سنّاٹے کے عالم میں بلا روک ٹوک چلا۔

اس کائنات کی نسبت فلسفۂ جدید کے سب سے بڑے ۲ دو مذہب یہ سمجھے جا سکتے ہیں:۔ مذہب خیالی (IDEALISM) مذہبِ اصلی (REALISM) مذہب خیالی۔ آئیڈیالزم۔ وہ مذہب ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کائنات جیسی ہم کو نظر آتی ہے وہ محض ہمارا اپنا خیال ہے ورنہ دراصل یہ کچھ نہیں ہے۔ مذہب اصلی ریالزم۔ وہ مذہب ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ کائنات جیسی نظر آتی ہے ویسی ہی ہے اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اصلی اور بذات خود موجود ہے مذہبِ خیالی کو اگر پہلے لیا جائے تو اس کی بھی کئی شاخیں ہیں؛ سب سے بڑی تین یہ ہیں (۱) فاعلی یا اندرونی (۲) مفعولی یا بیرونی

(۳) مجرد یا محض ؛ ان تینوں میں اکثر جگہہ اختلاف رائے ہے لیکن اصول سب کا مذہب خیالی ہے ۔ برکلے اور فچے پہلی شاخ کے ، افلاطون اور کینٹ دوسری شاخ کے اور ہیگل اور شیلی ۔ تیسری شاخ کے قائل و موئد ہیں ۔ مذہبِ اصلی کے جانب سٹوارٹ مل اور بین کے نام لے دینا کافی ہے ۔

ان سب مذاہب کے مقابلہ میں ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان سب کی کمی پوری کرنے کے لئے ، دوسری طرف سے مذہبِ تصوّف ہے جس کے نکات و دقائق مولانا علیہ الرحمۃ نے اپنی مثنوی میں پورے کمال کے ساتھ بیان کئے ہیں ۔

مذہبِ خیالی یا بالفاظ دیگر مذہبِ تشکیکیہ کے ماننے والے مذہب اصلی کے ماننے والوں سے ہر مسئلہ پر دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور کسی جگہہ یہ دونوں گروہ دنیا و مافیہا کو ایک آنکھ سے دیکھنے پر راضی نہیں کئے جا سکتے ۔ مگر تصوف ؟ وہ ان دونوں سے بالا ہے ؛ وہ اس جگہہ پہونچتا ہے جہاں یہ دونوں قاصر ہیں ؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ پورے طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ یہ دونوں گروہ کسی قدر غلطی پر ہیں ، اور دونوں کے درمیان صلح کرا دیتا ہے ۔

اس سے پیشتر کہ میں ان دونوں مذاہب کو بیان کروں بہتر یہ ہوگا کہ آپ فلسفہ کی دو بڑی اصطلاحات کو ذہن نشین کریں ؛ ورنہ شاید آئندہ بحث پوری طرح سمجھ میں نہ آ سکے ۔ یہ اصطلاحات فاعل و مفعول ہیں ؛ فلسفہ میں فاعل سے وہ مراد نہیں لی جاتی جو قواعدِ صرف و نحو

میں لی جاتی ہے - یہی حال مفعول کا بھی سمجھ لیجئے۔ از روئے فلسفہ شئے مُدرِک فاعل کہی جاتی ہے۔ فاعل وہ کہا جائے گا جو بالفاظ دیگر مدرک کہا جاسکتا ہے - جس کو ادراک ہوتا ہے وہ کسی چیز کو سمجھتا یا جانتا یا خیال کرتا ہے۔ مفعول وہ چیز ہے جس کا ادراک کیا جائے، جس کو جانا جائے، سمجھا جائے یا جس کا تصور کیا جائے - مختصر یہ کہ جاننے والی چیز مدرک یا فاعل ہے اور جس چیز کو جانا گیا ہے وہ مفعول ہے۔ اسی وجہ سے عام خیال کے مطابق قوتِ مدرکہ فاعل ہے اور اشیاءِ عالم جن کا ادراک کیا جاتا ہے مفعول ہیں۔ مگر تصوف اس سے انکار کرتا ہے؛ وہ کہتا ہے کہ قوتِ مدرکہ بھی فاعل حقیقی نہیں؛ فاعلِ حقیقی کوئی اور شے ہے۔ یہ مسئلہ نہایت باریک مسئلہ ہے اور سچ یہ ہے کہ پوری توجہ کے بغیر مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے؛ تصوّف فاعلِ حقیقی کی تعریف یہ کرتا ہے کہ وہ مفعول نہیں ہوسکتا؛ یعنی ادراک نہیں کیا جاسکتا؛ اس کے دُھرانے کی حاجت نہیں کہ جس چیز کا ادراک کیا جاتا ہے وہ مفعول ہوجاتی ہے اور جو ادراک کرتی ہے وہ فاعل رہتی ہے۔ تصوّف کی دلیل ہے - اور میرے خیال میں بیّن دلیل ہے کہ قوتِ مدرکہ جو تمام دنیا و مافیہا کا ادراک کرنے کے وقت فاعل ہوتی ہے جس وقت خود اس کا ادراک کیا جائے مفعول ہوجاتی ہے - قوت مدرکہ ضرور ایک ایسی شے ہے جس کا ادراک کیا جاسکتا ہے - یہاں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اس کا ادراک کس طرح کیا جائے گا؟ فلسفہ کہتا ہے کہ قوّتِ مدرکہ خود اپنا ادراک کرتی ہے اور تصوف کہتا ہے کہ فاعل حقیقی ادراک کرتا ہے:

آپ ذرا ٹھہرئیے، غور کیجئے کہ قوّتِ مدرکہ کا ادراک آپ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ ضرور کر سکتے ہیں۔ آپ ادراک کا تصوّر کر سکتے ہیں، اس کی اصلیت پر بحث کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے لئے قواعد مقرر کر سکتے ہیں۔ اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ ایسی صورت میں جب کہ قوّتِ مدرکہ کا ادراک کیا جائے وہ مفعول ہو۔ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ فاعل کون ہے اور کس کو ادراک ہوتا ہے البتہ اس سے کسی کو انحراف نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ قوّت مدرکہ کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور وہ ایسی حالت میں ضرور مفعول کہی جائے گی۔ تصوّف کہتا ہے کہ فاعل حقیقی وہ ہے جس کا ادراک کسی صورت میں نہ کیا جا سکے جو کسی حالت میں مفعول نہ بن سکے؛ فلسفہ ادراک کرنے والی چیز قوّتِ مدرکہ کو سمجھتا ہے اور تصوف کہتا ہے کہ قوّتِ مدرکہ کو ادراک نہیں ہوتا بلکہ وہ کوئی اور افضل و اعلیٰ چیز ہے جس کو ادراک ہوتا ہے اور جو ادراک کرتی ہے؛ تصوّف بیان کرتا ہے کہ جو چیز ادراک کرتی ہے وہ ذاتِ حقیقی ۔ ذاتِ واحد ۔ ایک غیر محدود ذات ہے جو ہر وقت ہر جگہہ اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ گویا ادراک کرنے والی چیز ہماری قوّت مدرکہ نہیں ہے بلکہ وہ ذاتِ حقیقی ہے جو ہم میں جلوہ گر ہے۔ اب آپ غالباً فلسفہ اور تصوف کا فرق سمجھ گئے ہونگے۔ فلسفہ قوّتِ مدرکہ پر رُک جاتا ہے اور اسی کو ادراک کرنے والی شے مان کر فاعل سمجھ لیتا ہے، تصوّف اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور اس بنا پر کہ فاعل حقیقی مفعول نہیں بن سکتا ۔ یعنی ادراک کرنے والی

شے کا ادراک ناممکن ہے۔ وہ قوتِ مدرکہ کو محض آلہ سمجھتا ہے۔ اور ادراک کرنے والی شے ذاتِ حقیقی کو بیان کرتا ہے۔ اس ذاتِ حقیقی کو، اس ذاتِ واحد کو، فلسفہ کی زبان میں ہم شاپن ہیور کے ارادہ، یا ہیگل کے مدرکۂ مجرد سے مثال دے سکتے ہیں۔ ہیگل اور شاپن ہیور ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں لیکن تصوّف کہتا ہے کہ شاپن ہیور کا ارادہ اور ہیگل کا مدرکۂ مجرد ایک ہی چیز ہے! بالکل ایک۔ وہی جس کو تصوّف ذاتِ واحد اور وحدت الوجود کے نام سے پکارتا ہے۔ تصوف کے لحاظ سے فاعلِ حقیقی وہی ذات واحد ہے جو قوتِ مدرکہ کے فاعلِ عملی یا ظاہری ہے۔ فرق یہ ہوا کہ فلسفہ فاعلِ ظاہری و فاعل حقیقی میں فرق نہیں سمجھتا بلکہ دونوں کو ایک ہی تسلیم کرکے ایک بڑی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

مذہب تشکیکیہ یا خیالی کے ماننے والوں میں برکلے اوّل درجہ کے اشخاص میں سمجھا جاتا ہے۔ کیسی خوبی کے ساتھ وہ فلسفہ کا آغاز کرتا ہے، کیسی بلند پروازی کے ساتھ وہ تصوف کے قدم بہ قدم اونچا اُڑتا ہے، مگر آگے چل کر کیسی خاص غلطی کے باعث وہ تصوف سے جُدا ہوکر راستہ گم کردیتا ہے؟ یہ مضمون یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے نہایت مفید ثابت ہو بشرطیکہ کوئی دماغ اس کو دلچسپ صورت میں لانے کی طرف توجہ کرے۔ خیر یہاں وہ دلائل جو مذہب خیالی اور مذہب اصلی کی طرف سے اپنے اپنے دعوے کی سچائی میں بیان کئے جاتے ہیں قابل غور ہیں۔ مذہب تشکیکیہ یا خیالی کی

جانب سے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے چوٹی کی دلیلیں یہ ہیں :-

پہلی دلیل یہ ہے کہ کوئی چیز بلا اپنے قوّت مدرکہ کے عمل کے نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ خیال کی جا سکتی ہے ، گویا محض فاعل کا عمل کسی چیز کے دیکھنے یا تصوّر کرنے کا باعث ہے ۔ میں اس وقت لکھ رہا ہوں اور ایک سانپ میرے پاس سے گذر رہا ہے ۔ میں اُسے نہیں دیکھتا ۔ میرے لئے اس کا عدم وجود برابر ہے ، میرے خیال سے سانپ اُس جگہ نہیں ہے ؛ میرا دل و دماغ لکھنے میں مشغول ہے اس لئے سانپ نہیں ہے ۔ بالفاظ دیگر ۔ فاعل کا عمل نہ ہونے کی وجہ سے مفعول کا وجود ہی معدوم ہو گیا ۔ جس وقت آپ سوتے ہیں آپ کی قوّت مدرکہ عمل نہیں کرتی اور تمام آوازیں جو پیدا ہوں آپ نہیں سُن سکتے ۔ اکثر اشخاص کی آنکھیں سونے کے وقت پوری بند نہیں ہوتیں ؛ گویا ایسے حضرات کی آنکھوں کے سامنے تمام اردگرد کی چیزیں موجود ہیں ، تمام اشیاء کا انعکاس پردۂ شبکیہ پر ہو رہا ہے لیکن پھر بھی وہ سونے والوں کو نظر نہیں آتیں ۔ کیوں ؟ اس وجہ سے کہ قوّتِ مدرکہ یا قوّتِ ارادہ اپنا عمل نہیں کر رہی ہے ، فاعل اپنا عمل ان اشیاء پر نہیں کر رہا ہے ۔ گویا مفعول کا وجود محض فاعل کے عمل پر مبنی ہے کیا آپ کوئی چیز بلا اپنے دماغ کے فعل کے دیکھ سکتے ہیں ؟ اسی وقت کوشش کیجیے ۔ کیا آپ کوئی سامنے رکھی ہوئی چیز بلا امداد دماغ دیکھ سکتے ہیں ؟ ناممکن ۔ قطعی ناممکن ۔ قوتِ ارادہ کا فعل پہلے ہو گا اور دیکھنے کا فعل اس کا تابع

ہے۔ آپ بلا قوت ارادہ کے فعل کے کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے، کوئی تصوّر نہیں کر سکتے، کوئی آواز نہیں سُن سکتے۔ تم کو عالم کے وجود کا علم کس طرح ہوتا ہے؟ محض حواس خمسہ کی بدولت۔ لیکن حواسِ خمسہ فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں جان سکتے۔ حواس خمسہ اسی وقت اپنا فعل کرتے ہیں جب قوت مدرکہ یا ارادہ ان کے ساتھ منتقی ہو اور دماغ اُن کے ساتھ عمل کر رہا ہو؛ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواسِ خمسہ بذاتِ خود کوئی فعل نہیں کر سکتے، بلکہ قوت مدرکہ یا ارادہ ان کے ذریعہ سے اپنا عمل کرتی ہے؛ وہ محض دل ودماغ کے مختلف آلے ہیں۔ مختصر یہ کہ قوت مدرکہ کے عمل کے بغیر حواسِ خمسہ محض بیکار چیز ہیں، اور قوتِ مدرکہ ہی بزبانِ فلسفہ فاعل ہے؛ لہذا بلا عمل فاعل نہ کوئی چیز دیکھی جا سکتی ہے نہ سُنی جا سکتی ہے، نہ سونگھی جا سکتی ہے، نہ چکھی جا سکتی ہے، اور نہ چھوئی جا سکتی ہے۔ گویا کسی چیز کا علم آپ کو بغیر عملِ فاعل کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو کچھ علم یا ادراک آپ کو ہوتا ہے وہ آپ ہی کی قوت مدرکہ کا فعل ہے۔

دوسری دلیل مذہب تشکیکیہ کے حامی یہ پیش کرتے ہیں کہ حواسِ خمسہ قابلِ اعتبار چیز نہیں ہیں؛ اُن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر آنکھ کو ہی لیجیے۔ ایک ہی چیز انسان کی آنکھ کو کچھ اور نظر آتی ہے اور چیونٹی کی آنکھ کو کچھ اور۔ ہاتھی کی آنکھ کو ہر چیز انسان کی آنکھ سے بدرجہا بڑی معلوم ہوتی ہے؛ مینڈک کو پانی میں چیز صاف نظر آتی

ہے اور ہوا میں - جہاں انسان کی آنکھ کو صاف نظر آتی ہے مینڈک کو
دھندلی معلوم ہوتی ہے ۔ اب یہ فیصلہ طلب ہے کہ کس کی آنکھ قابلِ
اعتبار ہے ؟ ایک چیز کا جسم دراصل اس قدر بڑا ہے جس قدر ہاتھی کو نظر
آتا ہے ، یا جس قدر انسان کو نظر آتا ہے وہ صحیح ہے ؟ اگر علم الاعداد سے
کام لیا جائے تو میرے خیال میں چیونٹی کی آنکھ سب سے زیادہ قابلِ اعتبار
سمجھی جائے گی ، کیونکہ حیوانات میں چیونٹی انسان سے شمار میں بڑھ جائیگی ،
اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو ایک معمّہ اور پیدا ہوتا ہے ۔ اگر
انسان کی آنکھ خوردبین کے اصول پر بنائی جائے ، آنکھ کے لنس کو
بجائے موجودہ حالت کے پردۂ شبکیہ کے مقابل میں دوسری طرح قایم
کیا جائے ، تو تمام عالم کی شکل وصورت بالکل پلٹی جاتی ہے - ہر مکھی
انسان کے لئے ایک آفت ناگہانی نظر آنے لگتی ہے ۔ یا اگر انسان
کی آنکھ دوربین کے اصول پر بنائی جائے تو بھی تمام کی ہیئت بالکل
تبدیل ہو جائے گی ۔ اوّل تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری آنکھ ایک چیز
کو جس قدر بڑا یا چھوٹا دیکھ رہی ہے کہاں تک اصلیت کے لحاظ سے
قابلِ اعتبار ہے ؛ دوسرے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ عالم جس طرح کا ہم
کو نظر آرہا ہے یہ ہماری آنکھ کی موجودہ حالت کا کرشمہ ہے ؛ کیوں کہ
ابھی آنکھ کو کسی اور اصول پر قائم کر دیا جائے تو تمام عالم ازسرتاپا مختلف
ہو جائے گا ۔

یہ ہی حالت حواس بقیہ کی ہے - آنکھ ، ناک ، کان وغیرہ موجودہ

حالت اور موجودہ صورت میں عالم کا تصور ایسا کر رہے ہیں۔ گویا انسان کے اعضاء و اعصاب کی موجودہ ساخت پر تمام عالم کی موجودہ صورت مبنی ہے اگر ساخت پلٹ جائے تو تمام عالم پلٹ جائے۔ یہاں یہ جواب مخالفین کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ آنکھ جس اصول پر مبنی ہے قانون قدرت کے لحاظ سے مبنی ہے اور اس لئے ہمیشہ اسی اصول پر قائم رہے گی؛ اس کے تبدیل ہو جانے کا گمان محض ناممکن یا فرض محال ہے۔ لیکن در اصل یہ جواب بھی ناکافی اور غلط ہے، اس لئے کہ نظریۂ ارتقا تھیوری آف ایوولیوشن۔ نے صاف طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ہماری تمام ساخت ایک بڑے انقلاب اور گوناگوں تبدیلیوں کے بعد جسم انسانی کی ساخت تک پہونچی ہے، اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کہاں تک جائے گی۔ اس لئے آنکھ، کان وغیرہ سب کی ساخت میں برابر تبدیلی ہوتی رہی اور جاری ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ یہ حواس خمسہ کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں؛ کسی طرح بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یا سمجھ رہے ہیں یا سُن رہے ہیں، یا چھو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ محض ہمارے اپنے حواسِ خمسہ کا کرشمہ ہے، ہماری قوت مدرکہ کا عمل ہے فاعل کا فعل ہے، بس اور کچھ نہیں۔ اسی لحاظ سے مذہب تشکیکیہ یہ مانتا ہے کہ کائنات۔ اشیائے عالم۔ تمام تر اپنی ہی قوّت مدرکہ کا فعل ہے؛ محض خیال، دھوکہ، طلسم۔

مذہبِ خیالی یا تشکیکیہ کے اور بیشمار دلائل نظر انداز کر کے مذہبِ اصلی

کو دیکھنا چاہیئے۔ اس مذہب کی طرف سے مذہبِ خیالی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہر چیز بذاتِ خود اصلی اور واقعی ہے۔ ہمارا احساس اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ہر چیز ہمارے حواسِ خمسہ پر عمل کرتی ہے اور ہم اُسے دیکھتے یا سنتے ہیں؛ اگر تمام عالم کی اصلیت ہمارے اپنے خیال یا قوتِ مدرکہ کے فعل سے زیادہ نہیں ہے تو ذرا اس رومال کو گدھا تو بنا دیجیے؟ ذرا بجائے اس دیوار کے جو سامنے موجود ہے شیر تو پیدا کر دیجئے؟ ذرا میرے اس قلم کو جس سے میں لکھ رہا ہوں ایک خوبصورت محل میں تبدیل کر دیجئے؟ مگر نہیں، ایسا آپ نہیں کر سکتے۔ دیوار آج بھی دیوار ہے اور کل بھی دیوار ہی رہے گی، رومال رومال ہی نظر آئے گا؛ قلم قلم ہی دکھائی دے گا؛ تمام اشیاء عالم ہمارے حواس خمسہ پر وہی اثر کریں گی اور وہی فعل کریں گی جو اب کر رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم اصلی ہے، اس میں قطعی اصلیت ہے اور بیرونی اشیاء کا فعل ہمارے حواس پر، ہمارے تصور یا ادراک کا باعث ہوتا ہے۔ تمام اشیاء عالم بیرونی طور پر بذات خود اصلی اور واقعی ہیں؛ ہماری اندرونی قوت مدرکہ یا کسی اور قوت کو اُن کے وجود میں مطلق دخل نہیں ہے؛ یعنی مفعول کا وجود خارج میں اصلی اور بذات خود قائم ہے، فاعل کے عمل کو اس کے وجود سے تعلق نہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں مذہب تشکیکیہ کی طرف سے اور دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم خواب میں تمام اشیاء خود پیدا

کر لیتے ہیں یا نہیں ؛ تمام جانور، زمین، دریا، وغیرہ وغیرہ جو کچھ
ہم خواب میں دیکھتے ہیں خود وجود میں لے آتے ہیں یا نہیں ؟ رہی یہ
بات کہ بیداری کی حالت میں بھی ہم دیوار کو گھوڑا بنا دیں، محض مشق
اور وقت پر منحصر ہے یعنی ناممکن نہیں ہے۔ علم مسمریزم اس کی مثال
میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس کا جواب مذہب اصلی کی طرف سے
دیا جاتا ہے اور اس کا جواب الجواب پھر مذہب تشکیکیہ کی طرف سے دیا
جاتا ہے ؛ بہ ہر حال فریقین ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، کوئی
قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مقصد اس طولانی بحث میں پڑنا نہیں
ہے لہٰذا ہم اسے چھوڑتے ہیں۔ البتہ یہ آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ مذہب تشکیکیہ
کا یہ دعوےٰ ہے کہ کائنات اور اس کی تمام اشیا محض ہماری قوّت مدرکہ
یا قوّتِ اندرونی کا کرشمہ ہیں، بیرونی طور پر کسی چیز کی کوئی اصلیت نہیں
ہے۔ جس وقت ہماری قوّتِ مدرکہ عمل کرتی ہے تو عالم کا وجود
ہوتا ہے ؛ اگر وہ عمل نہیں کرتی تو کسی بیرونی چیز کا وجود نہیں ہوتا
قوّتِ مدرکہ آپ جانتے ہیں، بزبان فلسفہ، فاعل ہے اور اشیاءِ عالم
جن کا ادراک کیا جائے مفعول ہیں، لہٰذا مفعول کا وجود ذاتی یا خارجی
کچھ بھی نہیں ہے بلکہ محض فاعل کے اندرونی عمل کا نتیجہ ہے۔ برخلاف
اس کے مذہب اصلی مدعی ہے کہ تمام عالم کا وجود اصلی ہے ؛ تمام
اشیائے عالم کا وجود خارجی اور بذاتِ خود ہے۔ وہ ہماری حواسِ
خمسہ پر اپنا عمل کرتی ہیں اُس وقت ہماری قوّتِ مدرکہ کو ان کا ادراک

ہوتا ہے۔ یعنی بزبان فلسفہ، مفعول کا وجود خارجی اصلی ہے اور جب اس کی اصلیت فاعل پر عمل کرتی ہے تو اُس وقت فاعل کو اس کا ادراک ہوتا ہے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ایک گروہ مفعول کے وجود کو بالکل فاعل کے عمل اندرونی سے جدا تسلیم کرتا ہے۔

اب تصوف کو لیجئے۔ وہ اس معمۂ لاینحل کو کس طرح حل کرنا چاہتا ہے؟۔

تصوف کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عالم میرا اپنا خیال، میری اپنی کرشمہ سازی ہے؛ مگر پھر بھی وہ مذہب خیالی سے بالکل جدا ہے۔ بعض یورپین محققین نے تصوّف کی اصلیت دریافت کرنے میں سب سے بڑی جو غلطی کھائی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوّف کو مذہب تشکلیکیہ کی ایک شاخ سمجھ لیا ہے۔ یہ غلطی محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ نے تصوف کو ابھی تک کما حقہٗ نہیں سمجھا ہے اور میرے خیال میں وہ مستقبل جب کہ تمام دنیا پر سائنس کی روشنی چھا جائے سوائے تصوّف کے کسی مذہب کو جگہہ نہیں دے سکے گا۔ تصوّف کا یہ دعوے کہ تمام عالم میرا خیال اور میری کرشمہ سازی ہے مذہب تشکیکہ سے بالکل جدا ہے۔ اس کے دعوے میں لفظ 'میرا' کی ضمیر انسان کی قوتِ مدرکہ کی طرف نہیں پھرتی ہے بلکہ اس فاعل حقیقی کی طرف پھرتی ہے۔ جو قدرتِ مدرکہ کے ساتھ جلوہ فگن ہو کر فاعل علمی۔ یا فاعل بزبانِ فلسفہ یہ کہا جاتا ہے؛ جو نہ صرف انسان میں بلکہ ہر ہر چیز میں جلوہ فگن ہے۔ تصوف

دنیا کو فاعلِ علمی کا، قوتِ مدرکہ یا فلسفہ کے فاعل کا، خیال نہیں مانتا۔ بلکہ فاعل حقیقی کا، ذات جلوہ فگن کا، وجود واحد کا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف مذہب تشکیکیہ کی طرح عالم کو محض انسان کی ناچیز قوتِ مدرکہ پر مبنی نہیں ٹھراتا ہے۔ برکلے نے اسی غلط فہمی پر خواب کو قوت مدرکہ یا فاعل کی پیدا کردہ چیز مان لیا ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اُس نے عالم خواب کے فاعل اور عالم بیداری کے فاعل کو ایک ہی سمجھا ہے اور وہ ان دونوں میں امتیاز نہیں کر سکا۔ تصوّف کہتا ہے کہ دنیا فلسفہ کے عالمِ خواب والے فاعل یا عالم بیداری والے فاعل کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ میرا خیال ہے۔ میرا، مجھ ذات واحد کا، مجھ ذات حقیقی کا۔

تصوف مذہب تشکیکیہ کے اس دعوے کو صیحح مانتا ہے کہ تمام نام اور صورتیں، عیوب اور خوبیاں، غرض تمام تفریق اور صفات محض فاعل کے ذاتی عمل کا نتیجہ ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں مانتا کہ کسی چیز کا وجود خارجی نہیں ہے اور تمام عالم کا وجود محض انسان کی قوت مدرکہ یا تخیّل پر مبنی ہے۔ اسی طرح تصوف مذہب اصلی کا بھی اس حد تک مؤیّد ہے کہ دنیا میں اصلیت ہے، اشیاے عالم میں اصلیت ہے اور ان کا وجود محض فاعل کے عمل پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کو غلط بتاتا ہے کہ کائنات کی تمام صفات اور نادرات بالکل خارجی ہیں اور ان صورتوں کو فاعل کے اندرونی عمل سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ گویا تصوف مذہبِ تشکیکیہ اور مذہبِ اصلی کے درمیان ہے، بَین بَین ہے۔ یہاں ان دونوں مذاہب

کے جن حصّوں سے تصوف کو انکار ہے وہ سمجھنے کے قابل ہیں۔ مذہب اصلی
کہتا ہے کہ بغیر بیرونی عمل کے جو حواسِ خمسہ پر اشیاءِ عالم کرتی ہیں ہم اُن
کا ادراک نہیں کرسکتے۔ یہاں تک کہ تصوف مذہبِ اصلی کا ہم نوا ہے؛
لیکن آگے چل کر جب مذہبِ اصلی یہ کہتا ہے کہ ہمارا تمام تر ادراک محض خارجی
عمل کا نتیجہ ہے اور فاعل کا فعل ادراک خارجی اشیاءِ عالم کے عمل پر مبنی
ہے، تو تصوف صاف انکار کرتا ہے اور اس کو حد سے تجاوز کرجانا سمجھتا ہے
یہ مثال کی مدد سے اور اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔ اشیائے عالم میں سے
کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً اس پنسل کو لیجئے؛ اب پنسل کا وجود اس کا رنگ،
اس کا وزن وغیرہ وغیرہ کس چیز پر مبنی ہیں؟ ذرا غور کیجئے۔ اصلیت اس
پنسل میں بذاتِ خود موجود ہے۔ یہ دعوئے مذہبِ اصلی کا قابلِ تسلیم ہے
لیکن اس کا رنگ اس کا وزن وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ پنسل کی کل صفات
جس قدر اس عمل پر مبنی ہیں جو پنسل کی اصلیت ہمارے حواس خمسہ پر کرتی ہے
اسی قدر اس ردّ عمل پر بھی مبنی ہیں جو ہماری قوّتِ مدرکہ بذریعہ حواسِ خمسہ
پنسل کی اصلیت پر کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص رنگ کا اندھا COLOUR
(BLIND ہو تو پنسل کا وجود قائم رہنے پر رنگ اُڑ جائے گا۔ علیٰ ہذا
وزن بھی تغیّر پذیر ہے۔ اگر کسی پنسل کو ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر
تولا جائے اور اسی کو پھر ایک گہری زمین دوز کان میں تولا جائے تو
دونوں جگہ وزن بالکل مختلف ہوگا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایک ہی چیز
کا وزن لندن میں کچھ اور ہوگا اور ہندوستان میں کچھ اور۔ یعنی رنگ

وزن، وغیرہ تمام صفات تغیر پذیر اور فاعل کے عمل پر مبنی ہیں۔ آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ایک ہی چشمہ کا پانی جاڑوں میں ہاتھ ڈالنے سے گرم معلوم ہوتا ہے اور گرمی میں وہی پانی ٹھنڈا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پانی کے ٹمپریچر میں بہت فرق آجاتا ہے۔ پانی کا ٹمپریچر قریب وہی قائم رہتا ہے۔ بلکہ ہاتھ کے ٹمپریچر میں تبدیلی ہوتی ہے؛ جاڑے میں ہاتھ ٹھنڈا ہوتا ہے اس لئے پانی گرم معلوم ہوتا ہے اور گرمی میں گرم ہوتا ہے اس لئے پانی ٹھنڈا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ فاعل میں تبدیلی ہونے کے ساتھ ہی۔ اسی کے لحاظ سے مفعول کی صفات میں بھی تبدیلی واقع ہونا لازمی ہے۔ اس لئے مذہب اصلی کا یہ کہنا کہ "تمام عالم میں اصلیت ہے" صحیح ہے؛ لیکن یہ کہنا کہ "عجائبات عالم اور کائنات کی کرشمہ سازی تمام تر اصلی اور بذاتِ خود ہیں" غلط ہے۔ تصوف کا یہ قول کہ عجائباتِ زمانہ یا اشیاءِ عالم کی صفات، ان کی شکلیں، اُن کی باہمی تفریق، اسی قدر فاعل کے عمل پر مبنی ہے جس قدر مفعول کی اصلیت کے ردِ عمل پر" بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔

اب مذہب تشکیکیہ کے دعوے کو لیجئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ تمام عالم کے وجود کو محض قوّتِ مدرکہ کا ذاتی فعل سمجھتا ہے جس سے خارج میں بہ لحاظ فعل فاعل تمام صفات وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ یعنی بیرونی طور پر خارج میں کوئی اصلیت نہیں ہے جو کچھ ہے وہ اپنی ہی قوّتِ مدرکہ کا کرشمہ ہے۔ تصوّف اس مذہب کے دعوے کو اس حد تک تسلیم

کرتا ہے کہ تمام تفریق اور تمام صفات فاعل کے عمل پر مبنی ہیں؛ مگر اس سے تصوف کو انکار ہے کہ خارج میں کوئی اصلیت ہی نہیں تصوف کہتا ہے کہ ہر ہر چیز میں، ہر ہر ذرہ میں وہی اصلیت - وہی حقیقت، ذاتِ واحد، جلوہ فگن ہے۔ برکلے کہتا ہے کہ کسی چیز میں اصلیت نہیں ہے محض صفات کا مجموعہ اُس چیز کا وجود ہے اور صفات قوت مدرکہ کے فعل کا نتیجہ ہیں؛ افلاطون اور کنیٹ کا قول ہے کہ صفات کے پردے میں ایک اور چیز بھی ہے جس پر وہ صفات قائم ہیں؛ وہ چیز کیا ہے؟ "خیال" قوتِ مدرکہ کا ادراک - اسی پر تمام صفات مبنی ہیں؛ گویا کسی قدر پھیر کر مطلب اس کا بھی یہ ہی ہوا کہ سوائے قوتِ مدرکہ کے فعل کے فی الحقیقت خارج میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ مثلاً اس پنسل میں کوئی اصلیت نہیں ہے، جو کچھ یہ معلوم ہوتی یا نظر آتی ہے محض اپنی قوتِ مدرکہ کا عمل ہے۔ تصوف کہتا ہے کہ بہت اچھا یہ تمام صفات جو پنسل میں ہیں محض قوتِ مدرکہ یا فاعل کا عمل سہی - لیکن فاعل کے ایسے عمل کی وجہ کیا؟ کیوں فاعل نے پنسل کا خیال یا ادراک قایم کیا جب کہ خارج میں کوئی چیز اس کا باعث نہیں ہوئی؟ فاعل کی قوت عاملہ میں ہیجان کیوں ہوا؟ آخر کس چیز نے فاعل کو ایسے امر پر آمادہ کیا؟ یہ ہی وہ سوال ہے جس کا مذہب تشکیکیہ کچھ جواب نہیں دے سکتا - ہم نہیں کہہ سکتے کہ پنسل کی صفات نے بذات خود فاعل کی قوت پر عمل کیا؛ کیونکہ پنسل کی صفات فاعل کے عمل پر مبنی ہیں اور

اس کے عمل کے بعد پیدا ہوئی ہیں؛ فاعل کے عمل سے پیشتر ان کا وجود مطلق نہیں تھا۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ پنسل کوئی اصلیت رکھتی ہے جو آپ کے حواسِ خمسہ پر اثر کرتی ہے؛ حواسِ خمسہ اس اثر کو دماغ پر یا قوّتِ مدرکہ پر منتقل کرتے ہیں اور قوتِ مدرکہ اپنا عمل بذریعہ حواس اس چیز کی اصلیت پر کرتی ہے؛ اور اب تمام صفات بہ لحاظ عمل قوّتِ مدرکہ اس چیز میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یعنی خارج کی اصلیت نے پہلے ہماری قوّتِ مدرکہ پر عمل کیا اور قوّتِ مدرکہ نے اس پر ردِّ عمل کیا جس سے تمام شکل یا صفات خارج کی اصلیت میں نظر آنے لگیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ نظریہ مذہب تشکیکیہ اور مذہب اصلی سے نسبتاً زیادہ قابلِ تسلیم ہے۔ سب سے بڑا اعتراض مذہب تشکیکیہ پر سائنس کے اس قانون کے لحاظ سے پڑتا ہے کہ "کوئی عمل بغیر ایک برابر کے مخالف ردّ عمل کے نہیں ہو سکتا"؛ گویا عمل کا وجود بلا ردِّ عمل ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں بلا کسی خارجی اصلیت کے عمل کے، تنہا قوّتِ مدرکہ کا عمل اندرونی ناممکن ہے۔ آپ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجا سکتے؛ دونوں ہاتھوں کے ملنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ ایک موج ایک طرف سے اور دوسری طرف سے، آپس میں ٹکراتی ہیں تو جھاگ پیدا ہوتا ہے؛ دیا سلائی کو کسی چیز سے رگڑا جائے تو شعلہ نظر آتا ہے؛ نیگٹو پول جس وقت پازیٹو پول کی طرف بڑھتا ہے تو شعلۂ برق پیدا ہوتا ہے ہر چیز کے وجود میں آپ عمل اور ردِّ عمل دونوں پائیں گے؛ تنہا ایک

عمل کا بلا کسی ردِّ عمل کے موجود ہونا یا کسی کو وجود میں لانا قطعی ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ۔ تصوّف کے لحاظ سے جو اصلیت انسان کی قوّتِ مدرکہ میں جلوہ فگن ہے وہی ہر بیرونی چیز میں بھی موجود ہے۔ یہ ہی وہ اصلیّتِ بیرونی اشیاء کی صورت میں ہماری اندرونی اصلیت پر عمل کرتی ہے اور ہماری اندرونی اصلیت ان اشیاء کی اصلیت پر عمل کرتی ہے؛ اس عمل و ردِّ عمل کا نتیجہ دنیا کا وجود، زمانہ کی نادرات، اور عالم کی تفریق ہے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذاتِ واحد کو تصوف غیر محدود بتاتا ہے، اور ساتھ ہی اس کو ایک ایک شے کے ساتھ مخصوص کر کے محدود کرتا ہے۔ یہ اجتماع الضدّین ہے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہے؛ جس وقت تصوف کسی خاص چیز کی اصلیت کے نام سے اس کو پکارتا ہے تو اس سے اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ اصلیت کسی خاص شے کے ساتھ محدود ہے۔ نہیں بلکہ وہ ہمارے سمجھانے کے لئے ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو آسانی سے دل نشین ہو سکے۔ وہ عمل و ردِّ عمل کے بیان کرنے میں یہ کہتا ہے کہ ذاتِ واحد جو فاعل میں جلوہ فگن ہے عمل یا ردِّ عمل کرتی ہے۔ اس طرح سمجھئے کہ خلا اس پیالہ میں بھی ہے اور اس داوات میں بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں خلا پیالے میں یا داوات میں وہی خلا ہے؛ ایک ہی خلا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ خلا کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ٹکڑے

نہیں کیئے جا سکتے۔ کینٹ کے قول کے موافق خلا فاعلی بھی ہے اور مفعولی بھی؛ یہ ناقابل تقسیم ضرور ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس پیالے کی خلا یا اُس داوات کی خلا؛ گویا ہمارے اس کہنے سے خلا فی الحقیقت تقسیم نہیں ہوئی بلکہ محض سمجھانے کے لئے ہم نے خلا کو پیالے اور داوات کے ساتھ اپنی زبان میں مخصوص کر لیا۔ خلا در اصل وہی ایک ناقابل تقسیم رہی۔ اسی طرح ذاتِ واحد یا غیر محدود کو کسی خاص کی اصلیت اور کسی دوسری چیز کی اصلیت کے تعبیر کرنے سے محض ہم نے اپنی زبان میں اس کو دو چیزوں کے لحاظ سے صرف سمجھانے کے لئے مخصوص کر دیا ورنہ فی الحقیقت وہ قطعی غیر محدود ناقابل تقسیم اور واحد و یکساں ہے

اب پھر دماغِ انسانی حجت کرتا ہے اور اعتراض کرتا ہے کہ تمام اشیائ میں اصلیت مان بھی لی جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کی اصلیت وہی ایک ہے یعنی واضح طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ شکل و صفات وغیرہ تو محض فاعل کے ردِّ عمل کے لحاظ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اصلیت کوئی اور چیز ہے؛ ایک ناقابلِ بیان چیز، ایک شئے نامعلوم۔ اب یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ۔ اصلیت ہر چیز کی جدا ہو، ہر چیز کے پردہ میں ایک جدا نامعلوم شئے ہو؛ اور ایسی صورت میں بلا دلیل سب کی اصلیت کو ایک مان لینا دعوٰے بلا دلیل اور ترجیحِ بلا مرجح ہے۔ یہ ہی افلاطون کا مذہب ہے۔ وہ بھی ہر چیز کی نامعلوم

اصلیت کو جدا جدا تسلیم کرتا ہے اور اس طرح صحیح راستہ پر آتے آتے محض اس غلطی کی وجہ سے کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ ہم اس مغالطہ کو ذرا واضح طور سمجھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک نہایت باریک مسئلہ ہے اور اگر آپ کی نگاہ محض الفاظ پر تیزی کے ساتھ دوڑ گئی تو شاید ہم آپ کو سمجھانے سے قاصر رہیں، اور ہماری کوشش بے سود ہو۔ آپ نے اس قدر تو اچھی طرح سمجھ لیا کہ ہر چیز میں اصلیت ضرور ہے مگر ہر چیز کی شکل وصورت وغیرہ جیسی ہم کو نظر آرہی ہے وہ محض ہماری اپنی قوتِ مدرکہ کا کرشمہ ہے۔ گویا ہر چیز کی اصلیت، شکل وصورت میں فی نفسہٖ کوئی شکل یا کوئی صفت خارجی نہیں ہے وہ ایک نامعلوم شے ہے۔ اب آپ اس نامعلوم شے کو۔ اس اصلیت کو۔ ہر چیز میں افلاطون کی طرح جدا اور ایک دوسرے سے مختلف مانتے ہیں۔ گویا آپ کے خیال کو بالتصریح اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ صفات کے لئے حرف "ص" فرض کیجئے اور شے' نامعلوم کے لئے حرف "ن" فرض کیجئے۔ اب مثالاً پنسل اور میز کو لیجئے۔ پنسل کیا ہے؟ جواب یہ ہوگا کہ صفاتِ پنسل معہ ایک نامعلوم اصلیت کے۔ یعنی ص پنسل + ن؛ میز کیا ہے؟ جواب یہ ہی ہے کہ صفاتِ میز معہ ایک نامعلوم اصلیت کے۔ یعنی۔ ص میز + ن؛ لیکن آپ پنسل اور میز کی اصلیت نامعلوم کو یعنی "ن" کو جدا جدا تسلیم کرتے ہیں اس لئے ایک کی اصلیت کو ن ا رکھئے اور دوسرے کی ن ۲ فرض کیجئے تاکہ اس طرح

اصلیت میں بھی فرق ہو جائے، گویا اب پنسل اور میز کی یہ تعریف ہوئی

پنسل = ص پنسل + ج ۱

میز = ص میز + ج ۲

اور اسی طرح

رومال - ص رومال + ج ۳

انسان - ص انسان + ج ۴

وغیرہ وغیرہ

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ ہر چیز کی اصلیت وہی ایک ذاتِ حقیقی یعنی ج ہے یا علیحدہ علیحدہ اور مختلف یعنی ج ۱، ج ۲، ج ۳ وغیرہ وغیرہ؟ شکل وصورت اور صفاتِ ظاہری کو آپ نے قوّتِ مدرکہ کا کرشمہ مان لیا ہے، اصلیت آپ نے ہر چیز میں تسلیم کر لی اور اس کو شکل وصورت وغیرہ سے مُبرّا مانا ہے، البتّہ ہر چیز کی اصلیّت کو آپ ایک دوسرے سے مختلف بتاتے ہیں۔ یہاں اس بحث سے قطع نظر کر کے ٹھنڈے دل کے ساتھ اس بات پر غور کیجیے کہ اختلاف کیا چیز ہے؟ تفریق کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟ اختلاف وتفریق کا باعث کیا ہے؟ سوائے اس کے آپ اور کچھ جواب نہیں دے سکتے کہ صفات ظاہری اور شکل وصورت اختلاف کا باعث ہیں۔ اس پنسل اور اس میز میں ذرا فرق تو کیجیے؟ پنسل سیاہ ہے، میز بھورے رنگ کی ہے، پنسل سیدھی اور گول ہے؟ میز اس قدر اونچی ہے اس میں چار پائے بھی ہیں؛ وغیرہ وغیرہ - لیکن سیاہ ہونا یا بھورا ہونا، مدوّر

ہونا یا مستطیل ہونا، ایسا ہونا، ویسا ہونا، یہ سب صفاتِ ظاہری اور اشکالِ ظاہری ہیں، ان کو اصلیت میں دخل نہیں، یہ قوّتِ مدرکہ کے عمل و ردِ عمل کا نتیجہ ہیں، یہ تمام ذی حیات عالم کی نگاہ میں ایک سی نہیں ہیں، یہ بہ لحاظ عملِ فاعل تغیر پذیر ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ تفریق کرتے ہیں وہ بہ اعتبارِ صفات و اشکال کرتے ہیں۔ جب کبھی دو چیزوں کے درمیان اختلاف کرتے ہیں، اور آنکھ، ناک، کان، وغیرہ کا فعل آپ کی قوّتِ مدرکہ کا فعل ہے اور بہت زیادہ آپ کے اعصاب اور آلاتِ حواسِ خمسہ کی موجودہ ساخت پر مبنی ہے۔ مختصر یہ کہ۔ تمام تفریق اور اختلاف محض بہ لحاظ صفات و اشکال کیا جا سکتا ہے، عام اس سے کہ آپ کسی چیز کی نظری صفات بیان کریں یا اصولِ کیمیا کے لحاظ سے بیان کریں۔ پانی صاف شفاف چیز ہے۔ یہ ایک ظاہرا نظر آنے والی صفت یا صفت نظری ہے۔ پانی رقیق ہے، جل نہیں سکتا، خاص ڈگری تک گرم کئے جانے سے بھاپ بن جاتا ہے یا منجمد ہو کر برف بن جاتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ تمام صفات بہ لحاظ کیمسٹری ہیں مگر ہر صورت میں یہ صفات محض صفات ہیں۔ اصلیت نہیں ہیں، ذات نہیں ہیں۔ اس لئے آپ جب کبھی دو چیزوں کا مقابلہ یا توازن کریں گے تو آپ صفات و شکل وغیرہ کے ذریعہ سے کریں گے، آپ کا تمام اختلاف و تفریق محض صفات پر مبنی ہے۔ اگر صفات نہ ہوں تو آپ قطعی اختلاف و تفریق نہیں کر سکتے۔

بس اس قدر سمجھنے کے بعد اب آپ اصل بحث پر غور کیجئے، اب اس کو سوچئے کہ نامعلوم اصلیت سب کی ایک ہے ودج ۱ ہے یا علیٰحدہ اور مختلف ہے نج ۱، نج ۲

وغیرہ ہے؟ اس کو بار بار دھرانے کی حاجت نہیں کہ اصلیت - ایک ہو یا جدا ہر صورت میں وہ تمام صفات اور اشکال سے بالاتر اور مبرا ہے وہ مجرّد اصلیت ہے، اب اگر آپ اس کو جدا جدا مانیں اور ایک چیز کی اصلیت کو دوسری چیز کی اصلیت سے مختلف سمجھیں تو آپ علم منطق کے لحاظ سے ایک مغالطہ کا ارتکاب کرتے ہیں؛ یعنی پہلے آپ نے تسلیم کر لیا کہ مجرد اصلیت ہر شے کی صفات سے مبرا اور بالاتر ہے اور اب جدا جدا تسلیم کر کے اختلاف پیدا کرنے سے آپ اس اصلیت مجرّد میں صفات لگانا چاہتے ہیں کیونکہ آپ سمجھ چکے ہیں کہ بلا صفات کے آپ اختلاف اور تفریق قطعی نہیں کر سکتے. ایک چیز کو آپ نے صفات سے بالاتر اور مبرا تسلیم کر لیا اور اب پھر اسی میں آپ صفات پیدا کرنا چاہتے ہیں. یہ مغالطہ ہے یا نہیں؟ فلیسی (FALLACY) ہے یا نہیں؟ اس پر غور نہ کیجئے کہ افلاطون جیسے شخص نے بھی یہ ہی غلطی کھائی ہے بلکہ اس پر غور کیجئے کہ فی نفسہٖ یہ مغالطہ ہے یا نہیں؟ اس پر غور کیجئے کہ "کیا کہا جاتا ہے"۔ اس پر غور نہ کیجئے کہ "کون کہتا ہے" آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ اصلیت مجرّد میں تقسیم یا تفریق نہیں کر سکتے؛ آپ اس میں اختلاف نہیں کر سکتے؛ وہ ایک ہے، وہ سب میں ایک ہی ہے، وہی ایک "حق"؛ وہی ذاتِ واحد، ذاتِ حقیقی، ذاتِ غیر محدود.

ایک بورڈ ہے اس پر علم اقلیدس کی اشکال بھی بنی ہوئی ہیں، جاندار اشیاء عالم کی تصویریں بھی کھنچی ہوئی ہیں، قدرت کے دلچسپ مناظر کا خاکہ بھی اترا ہوا ہو علٰحدہ علٰحدہ دیکھنے میں بےشمار شکلیں، گوناگوں چیزیں نظر آتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر

نظر ڈالنے میں صرف ایک بورڈ ہے؛ سب کے پیچھے صرف ایک اصلیت ہے؛ وہی سیاہ تختہ۔ اب ان اشکال کو جدا جدا دیکھنا یا مجموعی طور پر تمام عالم کو دیکھنا آپکے نقطۂ خیال پر مبنی ہے۔ ایک بحرِ ذخار کو مجموعی طور پر دیکھ کر سمندر سمجھئے یا ایک خلیج، ایک ایک ابنائے، ایک ایک موج، ایک ایک حباب کو علیٰحدہ علیٰحدہ سمجھ کر اشکال وصفات کا بے پایاں دفتر قائم کیجئے، جو کچھ بھی ہو سمندر، سمندر ہے، اور وہی ایک سمندر رہے گا، آپ کی کوتاہ بینی اس کو محدود یا تقسیم نہیں کر سکتی۔ اور اگر میں اس سمندر کو مجموعی طور پر دیکھ سکوں، اس کی مجموعی کیفیت کا ادراک کر سکوں، تو میں چیخ اٹھوں گا کہ سوائے میرے کچھ نہیں ہے۔ میں ہی میں ہوں۔ میں ہی سوچتا ہوں، میں ہی لکھتا ہوں، میں ہی پڑھتا ہوں، میں ہی تعریف کرتا ہوں اور میں تعریف کرتا ہوں اور میں اعتراض کرتا ہوں۔ تصوف، آئیڈیالزم، ریالزم وغیرہ سب میرا ہی خیال ہے۔ تمام عالم میرا ہی کرشمہ ہے۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ لیکن پوچھنے والے اور بیان کرنے والے میں فرق کیا ہے؟ کچھ نہیں، وہی میں، صرف میں لامحدود میں۔

یک شبے مجنوں بہ خلوت گاہِ ناز ؛ گفت اے پروردگارِ بے نیاز
از چرا نامم تو مجنوں کردۂ؟ ؛ عشق لیلیٰ در دلم چوں کردۂ؟

یہ سوال کس نے کیا؟ میں نے؛ اور کس سے کیا؟ خود اپنے آپ سے؛ جواب کس نے دیا؟ میں نے؛ اور کیا دیا؟ یہ کہ

عشق لیلیٰ نیست ایں کارِ منست ؛ حُسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ منست

جنونِ ترقی

جنونِ ترقّی

میں لبِ ساحل موسمِ بہار کی روح پرور ہوا کا لُطف اس وقت اُٹھا رہا ہوں جب کہ آفتاب اپنی بشیمار جگمگاتی شعاعوں کے ساتھ اُفقِ مغرب کے قریب، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ لگانا چاہتا ہے۔

سطحِ آب سے رگڑتی ہوئی آنے والی ہوا ہر ہر جھونکے کے ساتھ میرے جسم میں مَس ہوتے ہی کچھ اس غضب کی خنکی۔ خنکی نہیں ایک ناقابلِ بیان سرور انگیز کیفیت۔ پھونک جاتی ہے کہ رہ رہ کر مجھے اچھی طرح نمایاں نہ ہونے والی پھریری کا احساس ہوتا ہے اور جاتا رہتا ہے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں، نیچے اوپر نظر دوڑاتا ہوں؛ بھری پُری دنیا کی لامحدود فسوں سازیاں آبادی کے حصّہ میں، اور قدرتِ بے مثال کی لازوال رنگ آمیزیاں سمندر کی سطح پر، میری آنکھوں کو، میرے دل کو، میرے دماغ کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں "کیا کوئی ان میں سے مجھے محوِ نظارہ کر سکتا ہے"؟

وہ انگارے کھانے اور آگ اُگلنے والا اژدرِ آہنی جو مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے کرتا، مجھے، جہاں میں چاہوں، آرام کے ساتھ پہونچا دیتا ہے؛

کیا ہے؟ آپ اس کو انجن کہیں یا اور کچھ، میں تو اس کو اپنے دماغ کی معمولی کرشمہ سازی سمجھتا ہوں؛ اور کیوں نہ سمجھوں جب کہ وہ میرے قبضۂ قدرت سے ایک لمحہ کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتا۔ میں اس سے اپنی سواری کا ہی کام نہیں لیتا، بلکہ اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں کا بھی کام لیتا ہوں۔ وہ میرے لئے ہر بازار میں، ہر مکان میں، ہر باغیچہ میں، بلکہ ہر جگہ برقی روشنی پھیلاتا ہے۔ وہ میرے لئے راستہ صاف کرتا ہے، سڑک بناتا ہے چھڑکاؤ کرتا ہے، اور پھر مجھے نہایت اطمینان کے ساتھ ٹرام پر بٹھائے ہوئے سیر کراتا پھرتا ہے۔ وہ میرے لئے آٹا پیستا ہے، چھانتا ہے، پکاتا ہے، اور پھر خود ہی دور دراز جگہہ سے عمدہ عمدہ ڈبوں میں بند کر کے میری میز تک پہونچا دیتا ہے۔ میں اس سے سب کچھ کام لیتا ہوں اور وہ میرا کل کام ادنیٰ اشارہ پر کرتا رہتا ہے؛ میں پوچھتا ہوں "کیا اب بھی میں نے روئے زمین کو فتح نہیں کر لیا"؟

یہ دخانی دیوانِ سیاہ ہزاروں لاکھوں من کا بوجھ لئے۔ جن کو آپ شاید جہاز کہیں۔ میرے معمولی سے حکم پر دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک سمندر کی بل مارنے والی موجوں کا فتح مندی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مدّو جذر آتا ہے، طوفان آتا ہے، تلاطم پیدا ہوتا ہے، سورج اور چاند کی کشمکش سمندر کی سطح کو پہاڑیوں کا ہمسر بنا دیتی ہے، انجرات آبی اور موسم برسات کا اثر موجوں کو ضرورت سے زیادہ متحرک کر دیتا ہے، گلف اسٹریم تمام بحری راستوں میں غضب کا

خطرہ پیدا کر دیتا ہے، برف کی تیرنے والی پہاڑیاں اچانک ٹکرا جانے کا شیوہ اختیار کر لیتی ہیں؛ سب کچھ ہوتا ہے، لیکن میں اپنے دیوانِ سیاہ پشت پر سوار عمدہ سے عمدہ شامپین اڑاتا سارے سمندر کو چھانتا پھرتا ہوں، یہ ہی نہیں بلکہ یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کے ایک ایک گوشہ کی خبر روز صبح کو اپنی چائے کی پیالی کے ساتھ سُن نہیں لیتا ہوں بلکہ پی جاتا ہوں۔ وہ کونسی چیز ہے جو اس اژدرِ آہنی یا دیو سیاہ کی سلطنت سے یہاں نہ منگا سکوں یا وہاں نہ بھیج سکوں؟ میں روئے زمین پر نہیں سطحِ آب پر بھی حکمراں ہوں؛ میں کیوں نہ سمجھوں کہ میں نے اس خوفناک سمندر کو بھی رام کر لیا ہے؟

پھر سب سے زیادہ یہ لوہے اور کپڑے کے جسم والا عُقاب جو بجلی کی طاقت کے ساتھ مجھے کرۂ ہوا کی بادپیمائی کا موقعہ دیتا ہے کس طرح میری حرکت پر سطحِ زمین سے انتہا کی بلندی تک پہونچ جاتا ہے۔ میں تمام حشرات الارض سے محفوظ، تمام آبی خطروں کی دسترس سے بلند، تمام طبقۂ زیریں کے آفات سے مطمئن، پوری دلجمعی کے ساتھ فضائے اثیر میں چکر کاٹتا پھرتا ہوں، پوشیدہ مقامات کو اوج سے دیکھتا پھرتا ہوں، اور نہ معلوم ہونے والی باتوں کو معلوم کرتا پھرتا ہوں۔ بڑے بڑے عقاب میرے نو ایجاد مرغ سبک سیر سے جس کو ایرو پلین کا خطاب بھی میں نے ہی دیا ہے۔ ڈرتے ہیں، اُس کی ہیئتِ کذائی سے گھبراتے ہیں، اس کی تیزیٔ رفتار و بلندی پرواز سے لرزاں و ترساں کونے کونے چھپتے پھرتے ہیں۔ میں پھر پوچھتا ہوں "کیا

کرۂ ہوا بھی میرے لئے قلمرو شامل نہیں ہے"؟

یہ تباہ کن وبا جو طرح طرح کا روپ بدل کر عرصۂ دراز سے انسانی آبادی کو اپنا تختۂ مظالم بنائی رہی ہے میری نو ایجاد انسداد اور قابل قدر حفظِ ماتقدم کے سامنے روز بروز گردن اطاعت خم کرتی جاتی ہے، اس کے غارت کن حملے میرے سائنس کے اصولوں پر مبنی۔ تدابیر کے مقابلہ میں سال بسال پسپا ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ہی نہیں۔ علم الابدان اور فلسفۂ ازدواج کی ماہیت معلوم کرنے سے میں نے نسل انسانی کی افزایش کے گوناگوں طریقے اختیار کرلئے ہیں میں ہر سال موت کو پیدائش کے لشکر سے برابر پسپا کر رہا ہوں۔ میرے تحقیقات کے ذخائر نسلِ انسان کو عروج کے انتہائی نقطہ تک پہونچانے میں پوری پوری کامیابی حاصل کر رہے ہیں، تعداد ہی کے لحاظ سے نہیں ہر لحاظ سے میں نسل انسانی کو انسان بنا رہا ہوں۔ میں غور کرتا ہوں وہ کیا انسان کو دنیا کا مالک بنانے میں میں کامیاب نہیں ہوں"؟

وہ جہالت آمیز رقابت جو زر، زمین، زن کی ہوس میں انسانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا کرتی تھی، اب میرے سوشل قانون کے سامنے نیست و نابود ہوتی جاتی ہے۔ وہ تعصبِ مذہبی جو محض اپنے حق پر ہونے کے زعم میں خون کے دریا بہا دیا کرتا تھا میری سائنس اور میرے فلسفہ کے انکشافات کے سامنے جہالت سے زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ خود مختارانہ حکومت جو ایک انسان کو محض اتفاق کی بدولت ظل اللہ بنا کر سفید و سیاہ کا مالک ٹھہرا دیتی تھی میرے قانونِ قوم کے سامنے قریب قریب تمام دنیا سے

غائب ہوتی جاتی ہے ۔ اور وہ جُوعِ فتوحات جو ایک ایک کو دوسرے ملک سے ٹکرا کر لاتعداد قوموں کو گوشۂ عدم میں پہونچا چکی ہے ۔ میرے قانون بین الاقوام ، توازنِ قوّت اور معاہداتِ امن کی آہنی زنجیروں میں باندھ کر زندانِ عدم بھیجدی گئی ہے ۔ "کیا اب بھی میں نے قتل و غارت کا بیج دنیا سے نہیں مٹا دیا" ؟

جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے کیا کیا کیا ؟ تو حیرت زدہ ہو جاتا ہوں ، ششدر رہ جاتا ہوں ، تصویرِ استعجاب بن جاتا ہوں ۔ میرے کارناموں کی کوئی انتہا نہیں ۔ دنیا کے کسی مشغلہ کو لیجئے ، مختصر یہ کہ کسی چیز کو لیجئے جو نظر آنا تو درکنار تصور میں آ سکتی ہو ، ممکن نہیں کہ میں نے اس کی اصلیت کو بھی دریافت نہ کر لیا ہو ۔ میں نے توہمات کو شکست فاش دی ہے ، میں نے مفروضاتِ بے بنیاد کو بیخ و بن سے اُکھیڑ ڈالا ہے ؛ میں نے گناہ و ثواب ، نیک و بد ، ممکن و ناممکن ، کے ضرر رساں عقاید کی قلعی کھول دی ہے ۔ میں نے کیا نہیں کیا ؟ جس چیز کو زمین نے اپنی تہ میں چھپایا اس کو میں نے کھود کر نکال لیا ؛ جس چیز کو آسمان نے بعید کر کے مجھ سے بچانا چاہا اس کو زمین سے ہی میں نے معلوم کر لیا ۔ جس سمندر نے بہانا چاہا اس کو میں نے اپنی قوّتِ علم و دماغ سے روک لیا ۔ جس حصّہ کو خشکی ملانا چاہے میں تقسیم کر دیتا ہوں ؛ اور جس کو سمندر جدا کرنا چاہیے میں ملا دیتا ہوں ، جس کو ہوا اُڑانا چاہے اُسے میں پکڑ لیتا ہوں اور جس کو کششِ زمین گرانا چاہے اس کو میں ہوا میں معلق اُڑائے اُڑائے پھرتا ہوں ؛ کیا اب بھی میں نے قدرت کو فتح نہیں کر لیا ؟

جمادات ، نباتات ، حیوانات ، آتش و باد و آب و خاک ، ان میں سے ہر ایک سے کیا میں اپنی طبیعت کے موافق کام نہیں لیتا؟ کیا وہ میرے سامنے سر جھکائے نہیں ہیں؟ یہ مجھے مجبور نہیں کر سکتے ، میں ان کو قابو میں لا سکتا ہوں؛ میں ان کے لئے نہیں ہوں، یہ میرے لئے ہیں. تمام وحشیانہ جذبات کو، تمام خونریزی پیدا کرنے والی تفریق کو، تمام جہالت آمیز نفسانیت کو میں نے میں نے دنیا سے یک قلم نکال دیا ہے؛ اور بقائے نسل انسانی کو حفظِ صحت اور حفظِ ماتقدم کے حصار میں ترقی کے راستہ پر لگا دیا ہے. میں عنقریب موت و زیست کی اصلیت سے بھی پردہ اٹھائے دیتا ہوں. میں انسان کو انسان سے، طاقت کو طاقت سے، حکومت کو حکومت سے کبھی نہیں ٹکرانے دوں گا. وہ میرے قوانین بین الاقوام و توازنِ قوت میں سرتاپا جکڑی ہوئی ہیں. میں انسان کی تعداد کو روز بروز بڑھا رہا ہوں، اُسے تندرست اور طاقت ور بنا رہا ہوں، اُسے متموّل اور بے فکر کر رہا ہوں، اُسے آزاد اور تعلیم یافتہ ہونے کا سبق دے رہا ہوں. دنیا کے ایک ایک گوشہ میں امن و عافیت کا جھنڈا میرے حکم سے لہرا رہا ہے اور تموّل و عیش، کامرانی و مقصدوری کا سمندر میرے زور سے بل مار رہا ہے. قریب ہے وہ دن کہ انسان تمام اصولی توہّمات کے جال سے نکل کر آزادی کے فضائے اثیر میں اپنی اپنی مسرّت آمیز ترنم ریزی اور نغمہ سازی سے تمام عالم کو فردوسِ کامرانی بنا دے. کیا اب بھی میں نہ کہوں کہ "میں نے جہالت و خوں ریزی کو دنیا سے معدوم کر دیا ہے"؟

پورے ایک ہفتہ کے بعد میں پھر شام کے وقت سمندر کے کنارے کنارے ٹہل رہا ہوں ۔ قمری مہینوں کی شروع کی تاریخوں میں سرِ شام سے نمودار ہو جانے والا چاند افق سے کسی قدر اونچا اپنی پھیکی روشنی سمندر کی آپس میں دست و گریباں ہو جانے والی موجوں پر ڈال رہا ہے ؛ دور سے نظر آنے والی بحری میناروں کی روشنیاں گل کر دی گئی ہیں ؛ سیر و تفریح کی غرض سے پڑی رہنے والی موٹر کشتیاں عجب خاموشی کے عالم میں کنارے کے قریب لگی ہوئی ہیں ؛ ملاحوں اور ماہی گیروں کے چھوٹے چھوٹے قدیم وضع کے جہاز ساحل پر کھینچ لئے گئے ہیں ؛ کشتیوں کی دوڑ ، تیراکی کے نظارے ، بحری فٹ بال اور پولو سب مفقود ہیں ؛ ایک وحشت ناک خاموشی نے ان تمام دلچسپیوں پر تسلط کر لیا ہے ۔ ساحل پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے ایک نہ ایک فوجی شکل نظر آتی ہے جو محسوس ہونے والی ہوا تک کی ہر سرسراہٹ پر کان کھڑے کرنے لگتی ہے ۔

میں اس وحشت و خاموشی کا اندازہ کرنے ایک جگہہ ٹھہر جاتا ہوں ، سامنے سے ایک تہ آب جانے والا جہاز اپنا سیاہ اور لمبا جسم جس میں سے قریب قریب نصف سے زائد پانی کے نیچے ہے ، عجیب خوفناک حسرت کے ساتھ چلا آ رہا ہے ؛ میرا دماغ اس کی حرکتِ فتنہ انگیز کے ساتھ خیالی میدان میں بلند پروازی شروع کر دیتا ہے ،

یہ بلائے بد ۔ جو میری سائنس کی انتہائی ترقی کا نتیجہ ہے ۔ اُسی

سکونِ عامہ اور امنِ عالمگیر کو غارت کرنے کے لئے متحرک ہوا ہے جس
کی حفاظت کے لحاظ سے میرا دماغ اس کو وجود میں لایا تھا، یہ حرکت
کرے گا، یہ بڑھے گا، یہ حملہ آور ہوگا، اور کئی سال کی محنت اور بچید
بتوں کے علاوہ بہت سی عزیز جانیں طعمۂ نہنگانِ آبی ہو جائیں گی یہ
ساحل پر غارت گری پھیلا دے گا، یہ ترقی یافتہ دنیا کی بیشمار ہستیوں
کو پل جھپکے پل میں سمندر کی تہ میں پہونچا دے گا!

وہی اژدرِ سیاہ جو انسان کی آسائش و ترقی کے لئے پیدا کیا گیا
تھا، اب زمین میں ہزاروں لاکھوں کے غول۔ نوجوان صورتوں کے غول
دنیا کے گوشہ گوشہ سے چن کر میدانِ کارزار میں اتار دے گا کہ لوہے
کی چمک، لوہے کی گرج، اور لوہے کی بارش سے، انسانی آبادی
کی سرسبز اور لہلہاتی کھیتی نیست و نابود ہو جائے۔

وہ مرغِ سبک سیر جو کرۂ ہوا کو قبضہ میں لانے کے ایجاد کیا گیا تھا،
اب فارغ البالی اور بے فکری کی نیند سونے والوں کے سر پر غضبِ ناگہانی
بن کر نازل ہوگا اور میدانِ رست و خیز سے راستہ بند کردئے جانے پر موجِ
ہوا میں شناوری کرتا ہوا کوسوں آگے اور دنوں پہلے خاموش آبادی
میں ہلچل ڈال دے گا۔

سائنس کی انتہائی قابلیت، ترقی کی آخری ایجادیں، ملتوں کی بڑی
سے بڑی امداد، اس بات پر خرچ کی جائیں کہ سکونِ عامّہ کو غارت
کردیں، امنِ عالم کو نابود کردیں، اور انسانی قربانیوں میں نہایت

چابک دستی دکھائیں، توپوں کی گرج ہوگی؛ شعاعِ برقی کی چمک ہوگی؛ گولوں کا مینہ برسے گا؛ انسانی درندوں کا دریا اُمنڈے گا اور ہزاروں لاکھوں نہیں، لاتعداد معصوم صورتیں عینِ شباب میں خون کے دریا میں غرقِ فنا ہوجائیں گی۔ مضبوط سے مضبوط قلعے، مستحکم سے مستحکم مورچے، اور پائدار سے پائدار بندشیں، اُسی سائنس کی ترقی اور ایجاد کی بدولت روئی کے گالوں کی طرح اڑا دی جائیں گی۔

اُسی سائنس کی بدولت جو دنیا کے انکشافات کا دعوٰے کرتے ہوئے انسان کی بقا اور امن کی حمایت کی ذمہ داری کرچکی تھی، اب کوئی چیز ہوا میں ہو یا خلا میں، خشکی پر ہو یا سمندر میں، اس طوفان خونریزی کو پسپا نہیں کرسکتی۔ اور لاکھوں کروڑوں جانیں زندگی کے زمانۂ عروج میں گھنٹوں اور ساعتوں میں ہست سے نیست ہوجائیں گی۔

آبادی کی وہ تمام ترقی، اعداد جو صدیوں کے حفظانِ صحت کی نگہداشت کا نتیجہ ہے، گھنٹوں میں آتشِ آہن کے نذر ہوجائے گی۔ وہ قوی و مضبوط جسم جو نسلوں کی غور پرداخت سے اس حد تک پہونچے تھے دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑوں کی ٹاپوں میں روند ڈالے جائیں گے۔ اور عمارات کی وہ سربفلک کشیدہ ساخت جو برسوں کی صناعی اور ترقی کا نقشِ آخریں ہے۔ ایک گولے کے دھماکے سے تحت الثریٰ کی خبر لائے گی۔ میں سوچتا ہوں۔ "کیا جہالت کے زمانہ میں بھی خوں ریزی کی تیز رفتاری

کے لحاظ سے انسان اسی قدر سرعت اور آسانی کے ساتھ اس قدر بیشمار جانوں کو غارت کر سکتا تھا؟"

تموّل کی اونچی سے اونچی چوٹی، اندوختہ کا بڑے سے بڑا انبار، خزانہ کا انتہائی ذخیرہ، جو برسوں پوری جانکاہی اور انتظام کی بدولت عالمِ وجود میں آئے تھے کہ انسان کی فلاح و بہبودی کے راستہ میں صرف کئے جائیں، صرف کچھ مہینے کے اندر ۱۳ انچہ والی توپ کے دہانے میں بھر بھر کر اُڑا دیے جائیں گے؛ لوہے کی صورت میں تمام ملکوں پر برسا دیے جاتیں گے۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا کہ زمانۂ جہالت میں بھی ایسی قلیل مدّت میں اس قدر بھرے پُرے خزانے، کسی عیّاشی میں، کسی لہو و لعب میں، کسی صرفِ جنگ میں خالی ہو سکتے تھے؟

وہی برقی تار، وہی بحری جہاز، وہی ڈاک خانہ کی خوش اسلوبی، جو پہلے صلح کے دامن کے قائم رکھنے میں معاون تھی اب شعلۂ خوں فشانی کے بھڑکانے میں سیدھے ہاتھ کا کام دیں گے، ہزارہا تدابیر اختیار کرنے پر بھی وحشت ناک خبریں چوبیس گھنٹے کے اندر ہی اندر، جائے وقوع سے دنیا کے دوسرے سرے تک پہونچ جائیں گی، گرانیٔ اجناس، انسدادِ درآمد و برآمد، ناقدریٔ روزگار، بیکاریٔ پیشہ وران، وہ کونسی بلا ہے جو محفوظ دنیا

کے سر پر بھی اسی عالمِ رُست وخیز میں نہیں منڈلائے گی؟ کیا زمانۂ جہالت میں ایک خونریزی کا اثر ساری دنیا پر ایسے ہی بُرے نتائج پیدا کرتا تھا؟

انسان کی انتہائی ترقّی اور دماغی قابلیت اس بات پر صرف کی جائے گی کہ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ جسم نہایت آسان طریقہ سے ـ بے جان کردئے جاسکیں. سونے کے بڑے سے بڑے ڈھیر اس لئے خرچ کئے جائیں گے کہ لوہے کے فتنہ انگیز گولے بیشمار بنائے جاسکیں، اور سائنس کی تمام ایجادیں صرف اس غرض سے عمل میں لائی جائیں گی کہ انسان کو روئے زمین پر، سطحِ آب پر، اور عالمِ ہوا میں کہیں گوشۂ عافیت نصیب نہ ہوسکے.

میری تمام بندشیں، تمام معاہدے، تمام قوانین بین الاقوام و توازنِ قوّت، تمام سوشل اور پولیٹکل جکڑبندیاں، جو سینکڑوں دماغوں اور برسوں کی غور وخوض کا نتیجہ ہیں، گھنٹوں میں تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر پھینک دئے جائیں گے، جوعِ ملک گیری و ہوس جاہ طلبی کی طاقتیں پوری قوّت کے ساتھ بڑھ بڑھ کر آجائینگی اور اسی ایجاد و ترقی کے زیرِ سایہ و زیرِ حمایت انسانی آبادی کے ساتھ وہ وہ مظالم کئے جائیں گے جن کی نظیر تاریخ عالم کے زمانۂ جاہلیت میں بھی نہ مل سکے.

میں سوچتا ہوں اور بے چینی کے ساتھ سوچتا ہوں کہ میری ترقّی، میری ایجاد، میری تمامتر دماغی قابلیت انسان کے لئے باعثِ فلاح ہوئی یا موجبِ ہلاکت ؟

— — — — — — —

آہ ! انسان کس قدر مجبور، کس قدر مغرور، اور کس قدر جاہل ہے :-



ہاں! نہیں!!

''ہاں! نہیں''

سچ یہ ہے کہ میں صرف تھکا ہوا ہی نہیں تھا بلکہ میری طبیعت بھی مُنغّض تھی۔ کل ہم ایک اچھی ٹیم سے چار گول سے جیت چکے تھے؛ اور آج یعنی اس دن جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ ہم ایک معمولی ٹیم سے ایک گول سے ہارے تھے، مجھے ٹور پر جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ اور میں اس وقت تک ناکامیابی کو سگرٹ کے دھوئیں کے ساتھ اڑا دینے کا عادی نہیں ہوا تھا، اس کو تجربہ کار ذنگلی کھلنڈرے کمزوری کہتے ہیں، مگر یہ کمزوری اس وقت تک مجھ میں تھی، تاہم میں اپنا کوٹ اُتار کر، آستیں چڑھاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا؛

شام کا وقت تھا، آفتاب قریب قریب غائب ہوتا جاتا تھا، اور پہاڑ کی تکان دُور کرنے والی ہَوا میرے پسینہ میں نہائے ہوئے جسم کو پھُریری کی صورت میں رہ رہ کر ہلا جاتی تھی، کچھ عرصہ میں مجھے سردی بھی محسوس ہونے لگی مگر میں اپنے خیالات میں اس قدر غرق تھا کہ ٹھنڈی ہَوا اپنے متواتر حملوں پر بھی مجھے اٹھنے اور گرم سوئٹر پہننے پر مجبور نہ کر سکی،

میں پاؤں پر پاؤں رکھے، کرسی کے ہتوں پر کہنیاں ٹیکے، تکیہ

سے ٹیک لگائے، بیٹھا تھا، کمرہ کا دروازہ میرے سامنے تھا، ورانڈے میں کھڑے ہو کر میں نے اکثر پہاڑ کی دلفریب سینری کا لطف اس عارضی قیام میں اُٹھایا تھا، کیونکہ یہ ہوٹل جس میں ہماری ٹیم ٹھیری ہوئی تھی ایک سر سبز اور بلند پہاڑی پر واقع تھا، میں نکر پہنے قمیص کی آستین چڑھائے، ننگے سر، سگار ہاتھ میں لئے، سیٹی بجاتا ورانڈے میں ٹہلا کرتا تھا۔ بلکہ دن بھر میں کئی کئی مرتبہ ورانڈے کے کٹہرے پر کہنیاں ٹیکے، جھکا ہوا، سامنے والی پہاڑیوں کے دل کش نظارے اور سرور انگیز ہوا کا مزہ لیا کرتا تھا، مگر اس وقت میں اس تمام لطف سے بےخبر تھا، غافل تھا۔

ہم کو اس ہوٹل میں ٹھیرے آج چوتھا روز تھا، دو کمرے ہم ۱۲ نفر وحشیوں کے قبضے میں تھے، اور ان دونوں کمروں کے اندر کی حالت ویسی ہی تھی جیسی فٹ بال ٹیم کے جائے قیام کی ہوا کرتی ہے۔ کھلے ہوئے ٹرنک کمروں میں جا بجا نظر آتے تھے، قمیص اور نکر گلہری کے گودڑ کی طرح جگہ جگہ پڑے ہوئے تھے، اور کھونٹیوں سے لے کر کرسیوں تک کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ایک آدھ پتلون، کوٹ، جیسٹر فیلڈ غرض کوئی نہ کوئی کپڑا لٹک نہ رہا ہو۔ کالر اور ٹائی جس بے پروائی کے ساتھ کرسیوں پر یا آئینہ والی میز پر بکھری پڑی تھیں اس کا لطف کچھ انھیں کو آسکتا ہے جو کالج ٹیم کے ساتھ کسی ٹور پر خوش قسمتی سے کبھی جا چکے ہوں، مختصر یہ کہ دونوں کمرے یا تو ٹکڑوں والے کی دکان

معلوم ہوتے تھے یا چھوٹے پیمانہ پر غدر کے زمانہ کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔
یہ سب کچھ سہی لیکن خدا کے فضل سے ہم میں سے کسی کی طبیعت اس وحشت وبے پروائی سے "اکتائی" نہیں تھی، اس کے تسلیم کرنے میں بھی ہم کو تامّل نہیں کہ ہم میں سے اکثر چلنے کے وقت۔ "ہائے میرا کالر" اور "ہائے میرا مفلر" کے نعرے مارتے تھے اور سچ یہ ہے کہ بعض اوقات گم شدہ چیزیں کم از کم، اس وقت ملتی بھی نہیں تھیں؛ کم از کم اس وقت میں نے اس لئے کہا کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ دوسرے شہر میں جب ہم جا کر ٹھہرتے تھے اور پھر وہاں گوڈر کی دکان کھل جاتی تھی تو اکثر پچھلی منزل کی گم شدہ چیزیں بھی مل جاتی تھیں، مگر اس تمام دقّت کے باوجود خدا گواہ ہو کہ ہماری عادت میں مطلق تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگر ہم نے ٹور میں کبھی احتیاط سے کپڑے رکھے ہوں تو ہم قیامت کے دن جواب دہ۔ یہ حالت آج بھی تھی، تمام کپڑے اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے اور سوائے میرے کوئی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا، اور سب تو بازار کا گشت لگانے یا پہاڑیوں کا طواف کرنے چلے گئے تھے اور میں اپنی طبیعت کی اُلجھن سے مجبور ہو کر فیلڈ سے سیدھا ہوٹل کی طرف بھاگا تھا۔

اس کمرے کے شمال والا کمرہ بھی ہمارے قبضہ میں تھا، البتہ جنوب کی طرف والا کمرہ اور کسی کے عمل دخل میں تھا۔ کوئی معمولی درجہ کی یورپین فیملی اس میں مقیم تھی، اس فیملی کے تمام صاحبان سے کم وبیش

ایک ایک دفعہ اور ایک سے کئی دفعہ میری گفتگو بھی ہوئی تھی، لیکن وہ ایک جس سے کئی دفعہ گفتگو کا موقعہ ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ روز ملتا تھا، عجیب شوخ طبیعت چیز تھی، دنیا کی اُن چیزوں میں سے جن کو غیر معمولی طور پر مخاطب کو اپنی طرف کھینچ لینے کا ملکہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی جن کو قدرت کے فیاض ہاتھوں سے بہت سی چیزیں ملی ہوتی ہیں جن کا اثر کالے کے زہر سے کم نہیں ہوتا، باتیں کرنے میں پیش دستی کی جرأت قسم لے لیجئے جو مجھے کبھی ہوئی ہو، اگرچہ دوسری جانب سے دو ایک مرتبہ ایسا موقع دیا گیا کہ میں بے تکلفی کی سرزمین میں دو ایک قدم آگے بڑھ جاؤں؛ مگر میں اس وقت تک دراصل ناتجربہ کار تھا یا جری نہ تھا، اس لئے بے تکلفی زبان اور قہقہوں تک محدود تھی، مگر آج مجھے کسی چیز کا مطلق ہوش نہیں تھا، اس وقت صرف ہارنے کا خیال میرے دماغ پر مسلّط تھا اور بس۔

اس ایک گول کا اثر جو ہماری ٹیم پر ہوا تھا سب سے زیادہ مجھ پر تھا، وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ اس گول کے ہونے میں مَیں اپنے آپ کو زیادہ قصوروار سمجھتا تھا۔ میں سنٹر ہاف بیک تھا، اور مجھ سے ایک وَالی مس ہوئی تھی؛ میرا خیال تھا کہ یہ گول اُسی کا نتیجہ تھا، کچھ بھی ہو میں پریشان تھا، اُدھیڑ بن میں ڈوبا ہوا تھا۔ کشمکش میں اُلجھا ہوا تھا، ابھی ہماری ٹیم کو ایک میچ دوسرے دن رائل آئرش رائفل سے کھیلنا باقی تھا، اس لئے مجبوری تھی ورنہ میں

تو غالباً سب کو یہی صلاح دیتا کہ پہلی ٹرین سے چل دو۔ مگر جس وقت ہم کالج پہونچے اور سب کو یہ معلوم ہوا کہ اس شکست کا باعث ......"

"یس! نو! یس، نو! یس، نو! یس، نو، ......

اس تابڑ توڑ ہاں، نہیں یا یس، نو کے حملے نے میرے سلسلۂ خیال کو یک لخت توڑ دیا۔ میں گھبرا کر کرسی سے اُٹھا، اور برآمدہ کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے یہ حملہ میری قوّت سامعہ پر ہوا تھا۔

"یس، نو! یس، نو! یس، نو!

وہی ایک جس سے مجھے کسی قدر بے تکلفی کی عزّت حاصل تھی ایک عجیب انداز کے ساتھ جلوہ گر تھا، تھا یا تھی؟ مجھے اقرار کرنا پڑتا ہے "گڑھی" اردو کے لحاظ سے صحیح لفظ سمجھا جا سکتا ہے۔ حلیہ اور نقشہ وغیرہ میں شاید اچھی طرح بیان نہ کر سکوں کیوں کہ کالج میں ہمیشہ جس چیز سے میں گھبراتا تھا وہ لاجک تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا وہ اپاٹومی تھی! عمر کا صحیح اندازہ بھی میرے دماغ کا کام نہیں! میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اس کی چمکتی ہوئی گوری پیشانی پر کوئی جھرّی یا شکن نظر نہیں آتی تھی اور اس کے سُرخ سُرخ نرم اور بھرے ہوئے رخساروں پر سلوٹ یا جھول کا کہیں نام تھا۔ سر کے بال کھلے ہوئے کمر تک پھیلے تھے اور گاؤن گھٹنوں سے کچھ ہی نیچا تھا جس میں سے فینسی جرابوں میں چھپی ہوئی گداز پنڈلی کا دلفریب اُتار صاف نظر آرہا تھا۔ ان باتوں سے شاید یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ وہ کم عمر اور

ناکتخدا تھی؛ مگر میں اب بھی نہیں کہہ سکتا کہ نتیجہ کہاں تک صحیح ماننے کے قابل ہے اس لئے کہ مجھے اپنی لاجک پر ذرا بھی بھروسہ نہیں! مجھے یاد ہے کہ ایک سال ایف اے میں اسی مضمون میں چاروں شانے چت تھا! خیر جو کچھ بھی ہو اُس کی صورت میری نگاہ میں دلفریب سے کسی قدر زیادہ تھی اور اس کا انداز و طرز گفتگو دل کش ہونے کے لحاظ سے مقناطیس سے کئی درجہ بڑھا ہوا تھا۔ میں ضرور اقرار کروں گا میں اس سے باتیں کرکے کبھی سیر نہیں ہوا، مگر اِس وقت جس شان دلربائی کے ساتھ وہ یکایک سحر ہوش رُبا کی صورت میں۔ یا آیہ "فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ" کے مانند۔ میرے سر پر نازل ہوئی تھی اُس کی ہو بہو کیفیت کم از کم میری طاقت بیان سے باہر ہے، ایک کبوتر کا پَر جس کو اُس نے اپنی پھونک سے اڑایا تھا، کانپتا، لرزتا کششِ ثقل کے ہاتھوں آہستہ آہستہ زمین کی جانب اُتر تھا اور اُس کی فتنہ زا آنکھیں اُسی پَر پر جمی ہوئی، عجیب تبسم آمیز انداز کے ساتھ زمین کی طرف جھکتی جاتی تھیں اور زبان یس، نو کے وظیفہ میں مشغول تھی: میں بیساختہ "وہ یہ کیا!؟" کہتا ہوا ورانڈے میں نکل آیا، مگر یقین کیجیے اُس نے اشارتاً یا کنایتاً، کسی طرح بھی کوئی توجہ ظاہر نہیں کی اور یس، نو، یس، نو کا وِرد بلا کسی تغیر کے جاری رکھا۔ اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ گفتگو ہمیشہ انگریزی میں ہوا کرتی تھی اور اس وقت بھی جو کچھ ہوئی اسی زبان میں ہوئی۔ (اُردو الفاظ کا ذمہ دار

مترجم ہے نہ کہ راوی)۔

میں "خدا خیر کرے، آخر اس کی کوئی انتہا؟ میرے خیال میں آپ کو اپنی آمد کے ایڈورٹائز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"یس، نو: یس......" (خدا خدا کرکے وہ پر زمین پر گر گیا اور یس، نو کا وظیفہ بھی بند ہوا) آہ! آپ۔ معین۔" (اب وہ ایک ناقابلِ بیان تجاہلِ عارفانہ کے رنگ میں میری طرف مخاطب ہوئی۔ "آپ نے کیا کہا؟"

میں۔ "میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ کو اپنی آمد کے ایڈورٹائز کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ "یس، نو" سوائے ایڈورٹزمنٹ کے اور کچھ نہ تھا۔

وہ۔ "آپ جو کچھ سمجھتے ہیں ہمیشہ غلط سمجھتے ہیں، یہ بھی آپ کی ایک نرالی خصوصیت ہے، آخر آپ مجھے بیچمز پلز سمجھتے ہیں؛ یا وِنولیا سوپ؟

میں۔ "ان میں سے ایک بھی نہیں۔ البتہ گستاخی معاف۔ وِنولیا کریم سمجھتا ہوں یا اوٹین؛

وہ۔ اور اس تشبیہ کا حصۂ مشترک کیا ہے؟ (مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا)

میں۔ "ہونٹوں پر استعمال کئے جانے سے تسکین ہونا! اور نئے نئے رنگ میں ایڈورٹائز کیا جانا۔

وہ۔ مگر جس کو آپ ایڈورٹزمنٹ سمجھتے ہیں وہ نہایت متانت آمیز بات تھی۔"

میں۔ "افسوس ہے میں اس کی اہمیت اب تک نہیں سمجھ سکا۔"

وہ۔ "آپ غالباً اس سے ناواقف ہیں، میرا یقین ہے کہ اگر آپ کوئی آیندہ کی بات دریافت کرنا چاہیں کہ ہوگی یا نہیں ہوگی تو اسی طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ ایک پَر لے کر اڑائیں اور بس، تو برابر وقفہ کے ساتھ اُس وقت تک کہتے رہیں جب تک کہ وہ پَر زمین تک پہنچے، ابھی میں ایک بات دریافت کرنا چاہتی ہوں جو بس پَر ختم ہوئی ہے! مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ہوگی۔"

میں۔ "مگر مجھے اس فالنامہ کے سچّا تسلیم کرنے میں شک ہے!"

وہ (مسکراتے ہوئے) "اور دنیا کی وہ کونسی بات ہے جس میں آپ کو شک نہیں"

میں (بالکل بے تکلف ہوکر) "آج کا دن یا حُسن دلفریب کا اثر"؟

وہ (میرے جواب کو سُنی اَن سُنی کرکے) "یقین نہیں تو آپ خود آزما کر دیکھ سکتے ہیں!"

میں "لیکن آپ کو اس کے سچا ہونے کا دعوے ہے تو شرط کر لیجیے! اگر میری آزمائش میں سچّا ثابت ہوا تو جو آپ کہیں میں دوں گا ورنہ بصورت دیگر جو میں کہوں آپ کو دینا ہوگا"

وہ۔ "منظور۔ منظور۔

میں۔ "بہت اچھا۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے" میں یہ چاہتا ہوں کہ سچ

ہے

اور جھوٹ ابھی معلوم ہو جائے۔ لہذا میں یہ سوال اپنے دل میں لیتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں آپ کریں گی یا نہیں؛ بس اسی پر ساری آزمائش ہے.....

وہ (بات کاٹ کر) لیکن اس کے دریافت کرنے سے کیا فائدہ ؟

اس کا جواب آپ مجھ سے خود پوچھ سکتے ہیں۔"

میں ۔"لیکن آپ سے پوچھنے سے پیشتر میں اس فالنامہ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

اب فوراً میں نے زمین سے وہی پَر اٹھالیا اور پھونک سے اُڑا کر۔ اُس کے روکنے پر مطلق بھی توجہ نہ کر کے ییس، نو کا ورد شروع کر دیا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ خاموش ہو کر کیوں ایک طرف کھڑی ہو گئی، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے اس سوال پر آزمائش نہ کرنے دے گی، اور مجھے خاموش کرنے کے لئے جب اس کی زبان بیکار ثابت ہوتی تو ہاتھ سے کام لے گی، مگر ایسا نہیں ہوا؛ وہ خاموش اُسی پَر کی طرف نظر جمائے، کٹہرے سے لگی کھڑی رہی اور میں ییس، نُو کا وِرد برابر کرتا رہا۔ میں نے پہلے سے ارادہ کر لیا تھا کہ میں اس وظیفہ کو کسی نہ کسی طرح ییس پر ختم کروں گا چنانچہ پَر کے زمین پر پہونچنے کے وقت ییس، میری زبان سے نکل رہا تھا۔ نکل رہا تھا میں نے اس لئے کہا کہ وہ شرارتِ مجسم "نو" نہایت بلند آواز میں کہتی ہوئی میرے اور پَر کے درمیان میں حائل ہو گئی۔ گویا مجھ میں اور اس میں یہ اختلاف شروع ہوا کہ فال ییس پر ختم ہوئی یا نُو پر۔ آپ خود اندازہ کیجئے کہ اُس کی ایک شرارت نے میری تمام جدّت کا خاتمہ کر دیا اور اب

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کس سحر دلفریب کے مزے لے رہا تھا۔ یہ تھا ہمارے فالنامہ کا اختتام، جس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے ٹہلنے کے لئے چلنے کی استدعا کی اور میں فوراً کوٹ اور ایوننگ کیپ پہن کر ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور پہنچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ "میں سچ کہتی ہوں یہ فالنامہ بڑا سچا ہے۔ میں نے اس وقت یہ معلوم کیا تھا کہ آج مجھے ٹہلنے کے لئے کوئی ساتھی ملے گا یا نہیں۔ جس پر وہ یس پر ختم ہوا تھا۔ اب دیکھ لو تم میرے ساتھ ہو۔"

میں۔ "لیکن میں اسے سچا نہیں سمجھ سکتا، میری آزمائش میں وہ جھوٹا ثابت ہوا۔"

وہ۔ اچھا یہ بھی سہی تو تم کو اعتقاد نہ تھا اور ایسی باتوں میں اعتقاد بڑی چیز ہے۔"

اس اعتراض پر میں واقعی لاجواب تھا مگر میں نے اب اور رنگ لیا، "لیکن اب مجھے اعتقاد ہے۔"

وہ۔ "تو اب وہ سچا بھی ثابت ہوگا۔"

اور واقعی مجھے اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تأمل نہیں کہ "یس" نو کا فالنامہ اعتقاد لاتے ہی فوراً سچا ثابت ہوا۔

میں جس وقت اس روح پرور اور مسرت انگیز واندوہ رُبا، چہل قدمی سے واپس آیا تو تمام ساتھیوں کو کھانے میں مشغول پایا۔ میری شکل دیکھتے ہی کپتان صاحب کی لعن طعن شروع ہو گئی۔ "معین۔ بڑے پروا ہو، کمرہ کھلا چھوڑ کر چلے گئے، آخر اس وقت تک تھے کہاں؟ واقعی میں کمرہ کھلا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کا جواب میرے پاس کچھ نہ تھا کہ میں کہاں تھا۔"

لیڈر

لیڈر[1]

لیڈر کو بقیہ افراد انسانی سے وہی نسبت ہے جو حضرت نوح کو اپنی سال خوردہ کشتی سے تھی یا یسوع مسیح کو بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں سے رہی۔ تاریخ عالم کا وہ باب جو آئندہ چل کر اس سربلند ہستی کی سوانح عمری پر روزِ ازل سے روشنی ڈالے گا دیکھنے اور سننے کے قابل ہوگا۔ فی الحال یہ حصہ اوراق سادہ کا مجموعہ ہے۔ عموماً ہندوستان کی تعلیم جدید اور خصوصاً سیاسیات کا وسعت پذیر دائرہ، لیڈر کے وجود کے لئے دومٹ نمبر اوّل سے کسی طرح کم نہیں، ہر تخم بیکار تھوڑے وقفے میں باکار و بارآور ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے ہیجان قومیت نے مادّہ فاسد کی طرح مختلف اجسام میں عمل گوناگوں کا اظہار اس درجہ کیا ہے کہ مسٹر مانٹیگو سے لے کر سر مائیکل اڈوائر تک ہر سرخ و سفید ہستی "قلم بہ دنداں" یا "شمشیر بکف" نظر آتی ہے۔ علم الاعداد کی عینک سے صاف نظر آتا ہے کہ گزشتہ دس سال کی قلیل مدت نے لیڈر کی افزائش تعداد کے ساتھ وہی کام کیا ہے جو موسم برسات حشرات الارض کے ساتھ کرتا ہے یا امداد جنگ

---

[1] نقیب ستمبر ۱۹۱۹ء

لیڈر

نے عطیہ خطابات کے ساتھ کیا۔ خوف ہے کہ چند ہی سال میں ہر طفلِ دبستان
مسٹر بونرلا اور ہر پٹھان محمد علی بن جائے گا۔ مسلمانانِ ہند میں سر سید
کے جیتے جی یہ فرقہ نہایت محدود اور قریب قریب معدوم تھا۔ محسن الملک
کے زمانہ میں شبہ ہوتا تھا کہ "ہمیں بیضہ برآرد پر و بال" وقار الملک کے
دور میں کھٹکنے کے آثار ہر چھلکے سے ہویدا ہونے لگے۔ اور نواب
اسحاق خاں کی دو عملی میں مخلوقاتِ نوخیز کلبلا کر نکل ہی تو پڑی۔
محاربات طرابلس و بلقان اور جنگِ عظیم الشان کی آب و ہوا کچھ ایسی موافق
آئی کہ اب بڑے بڑے شہروں کے گلی، کوچوں میں لیڈر کا وجود پیشہ ور
قانونی اختیار کرنے والے گروہ سے دُگنا چوگنا نظر آتا ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ ہر قاعدے کی مستثنیات کی طرح اس دعوے کی مستثنیات
کی مثال میں بھی یہ البیلا ضلع جو پُرانے زمانہ سے بیاجان عالم کی
راجدھانی کا جزو ممتاز رہا ہے۔ نہایت صحت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا
ہے۔ یہاں خدا کے فضل سے سیاسیات کا مفہوم رانگا سانگا کی
باقاعدہ سائیسی کے سوائے اور کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ پنجاب کے شور و
شغب کی خبریں اُسی لُطف کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں جس طرح وائنا
اور برلن کے تار، چشم بد دور، اس ضلع کا سکونِ مستقل مہاتما گاندھی
کی آندھی سے بھی ذرا نہ ہلا! اس کے متین و سکوت آمیز جبین پر کوئی تلاطمِ
سیاسی معمولی سی شکن بھی نہ ڈال نہ سکا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس
سرزمین پر راجہ بکرماجیت کے زمانہ کا سَتِ سلاحیت اب تک عموماً

استعمال کیا جاتا ہے، جس کی بدولت ہر فرد باختیار سیوا جی کا نقش ثانی بن جاتا ہے۔

ہندوستانی لیڈر زیادہ تر دو قسم کے دیکھے اور سنے جاتے ہیں:۔ قسم اوّل جبری اور قسم دوم اختیاری۔ جبری یا بالفاظ دیگر وہی وہ افراد ہیں جن کے گھر میں پیشۂ رہبری آبائی میراث کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے؛ یہ اپنے گردوپیش کی حالت پر قطع وبرید کا عمل جاری رکھنا ماں کے دودھ کے ساتھ پیتے ہیں؛ ان سپوتوں کے پاؤں پالنے ہی میں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی دُھن کے پکّے اور اپنے دعوے کے سچّے ضرور ہوتے ہیں؛ اُن کا بس نہیں چلتا۔ ورنہ صفحۂ روزگار پر کوئی "اَن داتا" بچتے نہ "نادر"۔ وہ ہر لحاظ سے "چو میرد مبتلا میرد۔ چو خیزد مبتلا خیزد" کی سچّی اور جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔ جبری لیڈر اب بھی معدودے چند ہیں اور ان کی تعداد میں کوئی قابل حیرت اضافہ ممکن نہیں؛ البتہ ہر تلاطم واقعات کے دور میں وہ ہدف سخت گیری بن کر تنزل پذیر ضرور معلوم ہوتے ہیں۔

زمانۂ موجودہ کے نبّاض، اختیاری لیڈر کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔ ایک اصلی، دوسرے مصنوعی۔ اصلی وہ ہیں جو محض شہرت و نام آوری کے لئے پیشۂ رہبری کو اسی لحاظ سے اختیار کرتے ہیں جس لحاظ سے متھرا کے ایک مشہور وید

ہر سالِ نو کی جنتری مفت تقسیم کرتے ہیں۔ یہ پیشۂ نیک اُن کے
لئے وہی معنی رکھتا ہے جو گرموفون کمپنی مس گوہر جان کے لئے
یا نوچندی کا میلا حسینانِ حسن نما کے لئے! مانا جاتا ہے کہ ایسے
افراد جبری لیڈر کی حرکات و سکنات کی نقل رات دن کرتے کرتے
"نقل مطابق اصل" بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے نمونۂ اختیاری کو جبری
سے تمیز کرنا اکثر اوقات ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ کوئی
علامت نمایاں "ٹریڈ مارک" کے ہم معنی آج تک معلوم نہیں ہو سکی ہے
جس سے اختیاری و جبری کا فرق نظرِ اوّل میں معلوم ہو سکے۔ یہ
پیشہ اختیاری ہمیشہ اپنے عامل کی حدودِ اثر و دائرۂ اعتقاد کو دو چار
ہی برس میں اتنی قدر وسیع کر دیتا ہے، جس طرح محض بلجیم کی
طرفداری مقبوضاتِ انگلستان کی حدودِ اربعہ کو بیک ضرب پھیلا
دیتی ہے۔ حدودِ اثر کی وسعت پچاس فیصدی دستِ غیب کا کام
پوری حد تک دیتی ہے۔ اس پیشۂ جامع کو دستِ غیب کا چلتا ہوا
عمل بنانے کے لئے محض جذباتِ قومی یا مذہبی کو چھیڑ دینے کی
حاجت ہے اور بس۔ کسی مسجد یا مندر کا قدم درمیان ہو۔ پنجہ آہنی
کے مظالم طرح طرح سے دکھائے جا سکیں، اور کچھ نہیں تو
قربانی یا "گئو رکھشا" کی پناہ لی جا سکے، پھر آمد کا ابرِ نیساں چندوں
کی بوچھار سے تھیلیاں نہ بھر دے تو ہمارا ذمہ۔ یہ تمام خراجِ سیاسی
نہایت آسانی سے محض ایک برمحل ڈکار کے ساتھ لیڈر صاحب کے

نذرِ معدہ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ حساب کتاب سوائے یوم الحساب کے کسی زمانے میں اور کسی جگہ نہیں لیا جا سکتا۔ گھانا اور غرانا" اسی وجہ سے موجودہ پالٹیکس کا جزوِ ضروری قرار پایا ہے؛ سیاحت کے لئے یہ پیشۂ سعید نہایت اعلیٰ درجہ کا "پاسپورٹ" ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان کی حدود کے اندر جس جگہ وُرُود کا ارادہ ہو لاکھوں افراد بلا سوچے سمجھے پلکیں بچھانے کو تیار۔ سمندر کی سطحِ آبی سے گزر کر دوسری دنیا کا قصد ہو تو بھی واپسی کے ایک برس بعد تک کے تمام مصارف کی کفالت لیڈر کی جیب پر کسی طرح نہیں پڑتی۔ ہندوستان کے باہر کی ہوا اس رنگ میں ایک دفعہ بھی کھا آنے سے "حج اکبر" کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر فوٹوگرافی سے لے کر جراحی تک جس پیشے کو اختیار کیجیے، اُمید سے زیادہ پھلے پھولے گا۔ خداداد ذہن رسا کو اس لحاظ سے استعمال کرنے پر کہ سرزمینِ سیاست میں کوئی قدم اس جگہ سے متجاوز نہ ہو جہاں نظربندی عبورِ دریائے شور اور سزائے موت کا سہ حدّہ نصب ہے، مرتبۂ جاہ و نمود اور لیڈری میں "قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى" کا فاصلہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر خدانخواستہ نافہم و جنون سرشت طبائع اگر مشکوک عینک سے دیکھنے لگیں تو بیک جست مرتبۂ فنا فی التاج حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آنریبل سے لارڈ یا کم از کم جوڈیشل کمشنر ضرور بن سکتے ہیں۔ ہر طرح اور ہر زمانے میں رہبرِ اختیاری کو وہ رتبہ حاصل رہتا ہے جو حکم کی

بازی کو تاش کے کھیل " برج " میں دیا جاتا ہے ، لیڈر کے روپ میں مد حکم کے غلام " ہیں تو جوڈیشل کمشنر کے بھیس میں " حکم کے بادشاہ ہو گئے " ! بازی ہمیشہ حکم کی رہی . لیکن اس میں شک نہیں کہ رہبرِ اختیاری کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے وہ گرگِ باراں دیدہ " ہونے کے علاوہ اور بوقلموں صفات کی بھی حاجت ہے - مثلاً حسب ضرورت معترض کی زبان اور حاکم کے کان ، دونوں کو گِل حکمت کرتے رہنا .

سب کے آخر میں اور غالباً سب سے زیادہ - رہبر مصنوعی کی باری آتی ہے - یہ عجیب ہستی ، ایک ایسی خانہ ساز ہستی ہے جو دو آتشہ سے لے کر چہار آتشہ تک ، ہر قوت و حدت کی ہو سکتی ہے . یہ آتشِ سیال واقعاتِ عالم کی معمولی سی ٹھیس سے چراغ پا ہو جاتی ہے . اس ذاتِ برق عادات کی معلومات مذہبیات سے شروع ہوتی ہے اور قومیات ، اقتصادیات ، سیاسیات وغیرہ کی منازل طے کرتی ہوئی واہیات پر ختم ہوتی ہے . جامعیت کے لحاظ سے اس کی تنہا ذات ہر جلسہ و صحبت میں " انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا " کے تازہ ترین اڈیشن کا کام دے سکتی ہے .

فلسفۂ اجماع سے لے کر فنِ معیشت تک تمام علوم و فنون اس بزرگ علم بھی کے سینہ میں مقفل ہیں اور اس لحاظ سے اس کا وجود دائرۂ احباب میں کتب خانۂ رواں " سے کم نہیں ، وہ اکثر ہمہ داں ، ہمہ فہم ، ہمہ گیر اور ہمہ گو " پایا گیا ہے .

بسا اوقات طریقۂ آبائی کو ترک اور پیشۂ رہبری کو اختیار کرنے کی تحریک اُن ہی اُصولوں پر مبنی ہوتی ہے جو ایک مشہور مصوّر کو طبیب بنانے میں کامیاب ہوئے تھے ۔ واقعہ نگارِ حال کی یہ بھی رائے ہے کہ اکثر افراد کسی جگہ باکار نہ بن سکنے پر "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق محض کسبِ اکلِ حلال کے لئے اس پیشۂ اختیاری کو اختیار کر لیتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ بالآخر اُس رانڈ کی طرح جو بیاہتا سے اچھی پڑ رہتی ہے، کسی با اختیار شخصیت سے کم نہیں رہتے ایک صاحب ۱۹۱۵ء میں سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ کورز "(SUPPLY AND TRANSPORT CORPS) میں بیل ہانکنے کے لئے بھرتی ہوئے تھے، بصرہ کی آب وہوا کی ناموافقت کی بدولت بیک بینی و دوگوش ۱۹۱۶ء سے پہلے ہی نام کٹا کر واپس آ گئے، اور کسی مصرف کی دوا نہ تھے؛ اخبار کی ایجنسی شروع کر دی، خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ ۱۹۱۹ء تک لکچرار اور اچھے خاصے رہبرِ مصنوعی بن گئے؛ ماننا پڑتا ہے کہ قوم کا ہانکنا، بیلوں کے ہانکنے سے، آسان کام ہے؛ اور ہونا بھی چاہیئے، بیل ٹھیرے محض حیوان، اور قوم ہے اللہ کے فضل سے حیوانِ ناطق ۔

میرے ایک اور عنایت فرما کم وبیش چار سال کا عرصہ ہوا، حسبِ مرضی ترقی نہ مِل سکنے پر ملازمتِ سرکاری سے دست کش ہوئے اور رفتہ رفتہ اس پیشۂ سہل الحصول کو اختیار کر بیٹھے۔ آج ۱۹۱۹ء میں وہ قوم کے

گروہِ رہبر کے مسلّمہ فرد ہیں۔ فرض کیجیے وہ اپنی ملازمت کے لکیر کے فقیر بنے رہتے تو زیادہ سے زیادہ آج تحصیل کی چہار دیواری میں یا محکمۂ نہر کے لبِ جُو "حکم شد" پر بلا سوچے سمجھے دستخط کرتے ہوتے اور مُلک تو درکنار ان کو اپنے شہر کے کاچھی نہ جانتے کہ وہ ہیں کس کھیت کی مولی، میرے خیال میں وہ ترقی کرتے کرتے محکمۂ نہر سے محکمۂ سمندر کے حاکمِ اعلیٰ بھی بن جاتے، جب بھی یہ عزّت نصیب نہ ہوتی کہ اُن کا نام سری نگر سے لے کر راس کماری تک کسی جگہہ اور کبھی بغیر "حضرت" یا "جناب" کے زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو۔

مصنوعی لیڈر کا غصّہ جس کو اصطلاح سیاسیات میں حمیتِ قومی، حمایتِ ملکی اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں، رات دن میں کم وبیش چودہ گھنٹے چہرے کے اُس حصّہ پر رہتا ہے جو اپنی بلندی وساخت کے اعتبار سے "کنچن چنگا" کی چوٹی کہا جاسکتا ہے۔ وہ دیسی عینک سے بدیسی کو دیکھتا ہے اور نظارہ کو ناقابلِ برداشت پاکر سیاسیات کا "ہلاکو خاں" بن جانا اپنا فرض اوّلیں سمجھتا ہے۔

قومیت کا مرض ایک مرضِ متعدی ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ تیس پینتیس برس کی عمر تک زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے، بعض اوقات پختہ کار افراد بھی جو سنِ کہولت سے دوچار ہوں اس وبائے عالمگیر سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور دیکھتے ہی دیکھتے فرشِ زمین سے عرشِ معلّیٰ کی خبر لانے لگتے ہیں۔ خواہ وہ مشہور عالم ڈاکٹر ہوں یا حکیمِ حاذق، کوئی اس کے

اثر سے محفوظ نہیں۔

یہ بیشک بجا ہے کہ ہر ابجد خوانِ قومیت ارسطو نہیں بن سکتا، لیکن باقاعدہ نگہداشتِ صحبت اور موزوں تادیب تھوڑے ہی عرصہ میں ایک شائق رہبری کو لیڈر کا خطاب دلا سکتی ہے۔ بسلمہ لیڈر بننے کے لئے متعدد کینچلیاں اُتارنے کی حاجت ہے اس عملِ ارتقا کے مختلف مدارج گزشتہ پانچ سال کے تجربہ پر حسب ذیل بیان کئے جا سکتے ہیں:-

اخبار بینی۔ جس وقت زمانہ غیر مطمئن کے واقعات کا غیر معمولی اثر کسی بھلے چنگے دماغ پر عملِ ہیجان شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کے ہاتھ اخبار کی طرف بڑھتے ہیں۔ مرضِ قومیت کی یہ سب سے پہلی نمایاں علامت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس عادت کی انتہا روزانہ صبح کو چائے یا ناشتے کے ساتھ کسی روزانہ اخبار کا پی جانا دریافت ہوئی ہے۔ جس وقت دل و دماغ علی الصباح اخبار کا پرچہ نہ پا سکنے سے انگڑائیاں یا جمائیاں لینے لگے تو گویا پہلی منزل کی تکمیل ہو گئی۔ مطالعۂ اخبار کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ آنکھوں ہی سے کیا جائے، اکثر و بیشتر کانوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اخبار فہمی۔ تھوڑے عرصہ کی باقاعدہ "اخبار نوشی" خود بخود "اخبار فہمی" کے درجہ تک پہونچا دیتی ہے، اس مرتبے پر پہونچتے ہی چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں، غائب و حاضر کا حال سب بلا واسطہ سمجھ میں آنے لگتا ہے، واقعاتِ عالم کا کوئی راز راز نہیں رہتا، مثلاً اخبار فہمی کا مادہ

پیدا ہونے پر جنگِ یورپ کی تمام حرکت کے وجوہات مع نتائج ناگزیر جنرل فاش اور جنرل ہنڈنبرگ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ باوجود شرائطِ صلح شائع ہو جانے کے پریسیڈنٹ ولسن کی غلطیاں پوری طرح بیان کی جا سکتی ہیں، قیصر ولیم کے مستقبل پر صلح کانفرنس سے شرط لگائی جا سکتی ہے اور اخباراتِ فتوحات کی تردید پورے استدلال کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ شاہانِ عالم کا مستقبل بذریعہ اخبار فہمی اس خوبی و یقین کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے کہ قیصر جرمنی اور انور بے اگر سُن پائیں تو مبہوت ہو جائیں اور سر مائیکل اور لارڈ چیمسفورڈ کے گوش زد ہو جائے تو نہ زبان رہے، نہ بیان۔

اخبار نگاری - یہ تیسرا درجہ ہے، لیکن لا علاج نہیں مانا جاتا، اس مرتبہ پر پہونچتے ہی تصنیف و تالیف کے مادۂ فطری میں ناقابلِ ضبط طوفانِ موج پیدا ہوتا ہے۔ آغاز اخبار نگاری سے اور اختتام کتاب نگاری پر، یہ آغاز و انجام سمجھیے۔ مقامی انتظامات سے لے کر بین الاقوامی سیاسیات تک کوئی عنوان ایسا نہیں بچتا جس پر اسٹوارٹ مِل اور برکلے سے چند گز آگے بڑھنے کا دعوےٰ نہ کیا جائے۔ محلّہ کے چوکیدار سے لے کر وزیر اعظم تک کوئی اس قلمرو اخبار نگاری کی سرحد سے باہر نہیں جا سکتا! الاندرونی، فنِ مقابلۃ الحکّام، علم رموز السیاسیات، فلسفہ اجماع، فلسفہ تجیتس، فلسفہ مابعد الهزلیات، فلسفہ مالیخولیا، اور ایسی ہی دیگر اہم اور وزنی تصانیفِ علمی کے دریا بہا دیے جاتے ہیں۔

اخبار رانی - اس درجہ پر ہر فرد قومی نہ پہونچ سکا ہے نہ پہونچ سکتا ہے؛ وقت اور مال کے علاوہ خاص مادّہ ہونے کی ضرورت ہے جو اخبار دال کے لئے نہایت ضروری ہے، یہ مادّہ محض قدرت سے ودیعت ہوتا ہے بی، اے کی ڈگری یا کوئی اور علمی ڈپلوما اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بعض اپر پرائمری کے بچے آنریبل چنتامنی کے کان کترنے کو تیار رہیں، جس طرح گاتے گاتے کلاونت اور کھیتے کھیتے ملاح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اخبار نکالتے نکالتے اخبار راں بن جاتا ہے۔ اس درجے پر وہ تمام فوائد وحقوق حاصل ہو جاتے ہیں جو "ایسوسی ایٹڈ پریس" کو بصورتِ جماعت حاصل ہیں۔ حال ہی میں راولپنڈی سے ایک تار دیا گیا تھا:-

"افغانی نمایندے سات مکانوں میں مقیم ہیں" کلکتہ پہونچنے تک اُس نے نیا جنم لے لیا۔ "افغانی نمایندے سات گھنٹے میں رخصت ہونے والے ہیں" اخبار راں دنیا میں تلاطم مچ گیا۔ صفحے کے صفحے رنگ ڈالے گئے۔ یہ تمام استحقاقِ سیاہ وسفید محض اخبار رانی ہی کے زیر سایہ

ف "ایسوشی ایٹڈ پریس" ASSOCIETED PRESS کو اور کچھ مادہ ملا نہیں اور خاموش رہنا شان خبر رسانی کے خلاف تھا لہٰذا فوراً یہ اطلاع اہم دی گئی "AFGHAN DELEGATES ARE LIVING IN SEVEN HOUSES. قدرت کی ستم ظریفی نے ایسا کچھ عمل کیا کہ کلکتہ میں تار اس طرح سمجھا گیا۔ AFGHAN DELEGATES ARE LEAVING IN SEVEN HOURS. نہ صرف سمجھا گیا بلکہ بڑے بڑے اخباروں نے کالم کے کالم افغانیوں پر اپنے لیڈر میں لکھ مارے۔

حاصل ہو سکتا ہے۔ اخبار رانی کے لئے سیاسیات میں لکھنا، سیاسیات میں ہنسنا، سیاسیات میں رونا، بلکہ یوں سمجھئے کہ، کل حوائجِ ضروری کو سیاسیات میں بجالانا نہایت ضروری ہے؛ اخبار راں کو سیاست کے پیچھے اُسی حد تک پڑنا چاہیئے جس حد تک نظامی پریس بدایوں دیوان غالب کی طباعت کے پیچھے پڑا ہے۔ اگر فلسفۂ آبادی کے علاوہ تعلیم و تعلّم یا معاشرت کی بے وقت کی راگنی الاپنی شروع کی تو یقیناً اخبار کے خریداروں کی تعداد اُسی ہفتہ میں ایک چوتھائی رہ جائے گی؛ اخبار راں ہوتے ہی اپنی آنکھوں کو تمام قوم کی عینک اور اپنی زبان کو تمام ملک کا گرمیوفون سمجھنے کے "اختیاراتِ شخصی" حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ہر اخبار راں ہستی اپنی ذات کو بجا طور پر "ہم" سے خطاب کرتی ہے۔ "ہم" فی الحقیقت تمام قوم کا مفہوم اپنے ساتھ لئے رہتا ہے، میں نے حال ہی میں کسی اخبار میں پڑھا تھا "ہمارے گھر میں بچّہ پیدا ہونے کی وجہ سے یہ غیر معمولی تاخیر اشاعت - - - -" کیا یہاں بھی "ہمارے" کا مفہوم کل قوم ہے؟ دورِ اخبار رانی کو دورِ "ہما ہمی" بھی کہتے ہیں۔

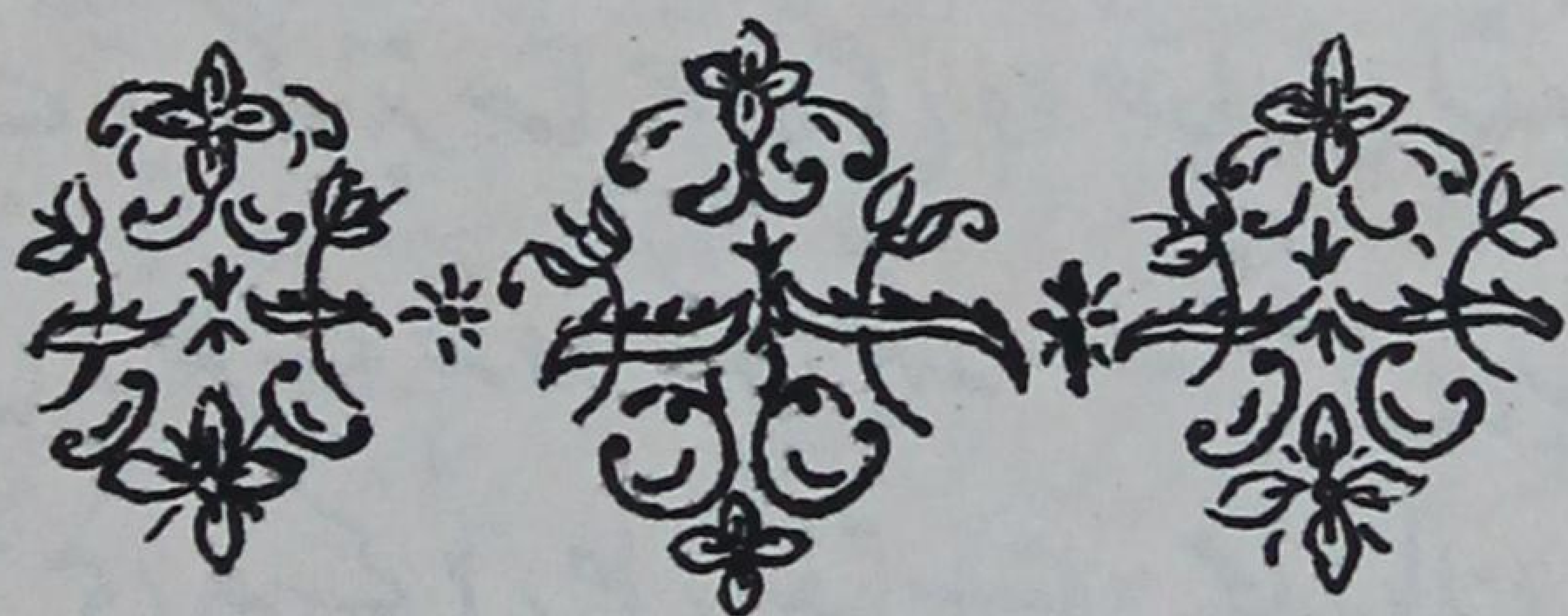
اخبار کشی - یہ مرتبہ "فنا فی السیاسیات" کا ہے۔ اس درجہ پر پہونچنے سے آواز میں دردِ مفروضہ اور بیان میں ایک نالۂ فرہادی پیدا ہو جاتا ہے۔ ذاتِ والاصفات اخبار کے لئے وہی اثر رکھتی ہے جو اکاس بیل ایک نوخیز درخت کے لئے؛ قلم میں وہ اعجازِ عزرائیلی پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض

اخبار دو چار سطروں ہی میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے، بعض ایک دو مضامین کا متحمل ہوتا ہے اور بعض سسکتا سسکتا دو چار مہینے دم توڑ لیتا ہے مگر ایک بھی ایسا نہیں رہتا جو بالآخر ایک نہ ایک دن "وہ ہے آخر موت" کے معمے کو سمجھ کر قبل از وقت عدم کو نہ سدھار جائے۔ ضمانت ضبط ہونا، مطبع ضبط ہونا، اور بعض اوقات "قلم دوات تک ضبط ہونا" کرشمۂ سحر نگاری قرار پاتے ہیں۔ ایک درجن اخبار و رسائل اگر زندہ درگور کر دینے کا فخر حاصل ہو سکا تو گویا معراج سحر نگاری ہو گئی، یہ ایک ایسا ڈپلوما مل گیا جس کا مجرّد اظہار آئندہ ہر اخبار کو جو اسی ہستی کے زیر ادارت شائع ہو کامیاب بنانے کا پورا بیڑہ اٹھا سکتا ہے۔

اخبار کُشی سے آگے بڑھنا مصنوعی و اختیاری لیڈر کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وادیٔ پُرخطر کے حدود اسی جگہ سے متصل ہیں۔ یہاں کوئی دیوانہ و سرشار ہی سر کے بل چل سکتا ہے۔ مجذوبانِ ازلی کو ہمارے سر برآوردہ لیڈر سے وہی تعلق ہے جو ایک دیوانہ کو فرزانہ سے ہو سکتا ہے۔ موجودہ لیل و نہار کی برکت سے نازنین رہبر کا بھی وجود ہو گیا ہے۔ اگر متاثر کرنا، ہر دل عزیز بننا، اور نظر فریبی، لیڈر کے ضروری اوصاف قرار دئے جائیں تو یقینی ایک نزاکتِ مجسم لیڈر، قوی الجثہ ہستی سے ہر طرح زیادہ کارآمد ثابت ہو صنفِ نازک نے بھی اشارہ ہائے چشم و ابرو سے رہبری کا کام لیا تو یقیناً ہمارا قافلہ منزلِ مقصود تک، اُس منزل تک جہاں سب کو جانا ہے، بہت جلد پہنچ کر

رہے گا۔ اس آخری قسم پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتا تھا مگر محض اس خوف سے باز رہتا ہوں کہ کہیں یہ مضمون اڈیٹر نقیب کا مضمون "بجلی" نہ بن جائے اور مجھ پر سرقہ کا الزام نہ تھوپا جائے۔ میرے ایک متانتِ مجسم دوست موجودہ زمانے کی رفتار دیکھ کر ہمیشہ مجھے یہ صلاحِ نیک دیا کرتے ہیں کہ ؎

دے کے لکچر پکارتے پھرئے
ہر گلی کوچہ "کام لیڈر کا"۔



خوابِ خیال

خواب و خیال[1]

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں آرام کرسی پر دراز، پائپ سلگائے محوِ تخیّل تھا۔ میز پر جلنے والا لیمپ اپنے سبز گلوب کی نقاب ڈالے دھیمی دھیمی روشنی کی شعاعیں چاروں طرف ڈال رہا تھا؛ کانس پر رکھّی ہوئی ٹائم پیس تنہائی کے عالم میں اپنی مہین آواز سے ٹِک ٹِک کا نغمہ مسلسل بجا رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں، میری آنکھیں نیم وا تھیں یا بالکل بند، مگر اس میں شک نہیں کہ میں کسی چیز کو ارادتاً نہیں دیکھ رہا تھا، ممکن ہے کہ بعض اشیائے گرد و پیش مجھے خود بخود نظر آ رہی ہوں۔

اکثر رات کے کھانے کے بعد پورے عرصہ تک میں تنہائی میں مشقِ تخیّل کیا کرتا تھا؛ واقعاتِ عالم اور اخبارِ حاضرہ، میری نگاہ کے سامنے سے گذرتے تھے اور میں ہر واقعہ کو اپنی عقل سے تولتا اور ہر عقدہ کو اپنے دماغ سے کھولتا تھا۔ میرے دائرہ تعارف کا ہر فردِ ذی فہم بلاحجت تسلیم کرتا ہے کہ میں بعض اوقات اجتہادِ ذاتی کے لحاظ سے سقراط کے مرتبے سے بھی کسی قدر اونچا نظر آتا ہوں، ایک مرتبہ نپولین کی زندگی پر نظرِ ثانی کرنے سے مجھ اس کی غلطیاں معلوم ہو جانے پر سخت تعجب ہوا تھا۔ واٹرلو کے معرکے میں اگر میں نپولین کے بجائے

[1] مطبوعہ ماہ فروری ۱۹۳۳ء نقیب

موجود ہوتا تو بلوچر اور ولنگٹن میرے فاتحانہ داخلے کے موقعے پر میری گاڑی خود کھینچتے ہوتے۔ نادرشاہ اور بابر "فلسفۂ تقسیم الاقوام" سے قطعی بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ محمود غزنوی اور ہلاکو خاں "علم فتوحاتِ امن آمیز" سے بالکل نا بلد معلوم ہوتے ہیں۔ جلال الدین اکبر میں استقلالِ ذاتی مفقود ہے۔ ابو الفضل مذہبیات سے بے بہرہ ہے، جہانگیر "فنِ فتوحاتِ ضعیفین" سے کورا ہے۔ میرے تمام احباب کی متفقہ رائے ہے کہ تختِ مغلیہ پر اگر میں رونق افروز ہوتا تو آج اُماکمنڈ سے ٹمبکٹو تک، یا چیرا پونجی سے ٹوبٹ کورن تک کوئی تفریق زبان، معاشرت، معتقدات، اور خصوصاً رنگ باقی نہ رہتی۔

اس عظیم الشان جنگ مغرب پر غور کرنے سے قیصر جرمنی کی علم الحرب سے ناواقفیت میری نظر میں ہویدا ہو جاتی ہے۔ ہنڈنبرگ کی غلطیاں میکنسن کا تساہل، وان ٹرپٹز کا تجاہل عارفانہ، اور ایسی ہی بے شمار غلطیاں مجھے صاف نظر آتی ہیں۔ مثلاً بلجیم میں گھسنا، قیصر کی پہلی غلطی، فرانس کی سرحد میں داخل ہو کر، کیلے کے بجائے پیرس کا رُخ کرنا دوسری غلطی ہیلیگولینڈ کے مقابلۂ بحری کے بعد بھی اپنی بحری طاقت کو ڈنکے کی چوٹ استعمال نہ کرنا۔ تیسری غلطی، اٹلی کو ریشہ دوانی کے لئے عرصہ دراز تک چھوڑ دینا۔ چوتھی غلطی، اور اسی طرح ہزاروں غلطیاں، لاکھوں حماقتیں۔

اگر میں قیصرِ جرمنی ہوتا تو سب سے پہلے سوئزرلینڈ میں گھستا۔ اٹلی کو ختم کرتا، اور جنوب کی طرف سے پیرس پر بڑھتا، بلغاری فوج سے یونان

پرورش کرتا، ترکی افواج کو براہ راست (ایران میں ہوتا ہوا) ہندوستان پر استعمال کرتا؛ اسٹریا کی طاقت طرابلس اور مصر پر کام میں لاتا، بحیرۂ روم سے درآمد و برآمد قطعی بند کر دیتا، اور اگر ضرورت پڑتی تو کھلم کھلّا انگلستان کے مشرقی ساحل پر پوری بحری طاقت سے ایک ضربِ سخت لگاتا، ماننا پڑتا ہے کہ محض میرا وجود تمام عالم کو تہ و بالا کر ڈالتا، اور یقیناً جنگِ عظیم کا نتیجہ ایسا کچھ نکلتا کہ پریسیڈنٹ وِلسن قلم بدنداں اور سر ایڈ ورڈ گرے سرنگوں ہوتے۔

واقعات حاضرہ میں روزانہ ایسی ہی فروگزاشت یا غلط رَوی پہلی ہی نظر میں مجھے نظر آجاتی ہے، پنجاب کی عنانِ حکومت کا ذمہ دار اگر میں ہوتا اور میرے زمانے میں خود سر عوام سر اُٹھاتے تو یقین کیجئے، مادۂ فاسد کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتا۔ مرضِ متعدی سے متاثر ہونے والے اجسام۔ ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جھیلم کی وساطت سے براہِ آب بحر ہند میں پہونچا دئے جاتے، میں افعی کو مار کر بچۂ افعی کی نگہداشت کرنا حماقتِ عظیم سمجھتا ہوں، سرزمینِ پنجاب کو میں از سرِ نو امریکہ اور یورپ کے افرادِ غیر ضروری سے آباد کرتا، لیکن حاشا و کلّا میں پنجاب میں ایک متنفس بھی اس لئے نہ چھوڑتا کہ بعد میں مرے مُردے اُکھڑے اور بات کا بتنگڑ بنائے، میری دورانِ حکومت میں غالباً جشنِ صلح کی مخالفت کی بھی تاب نہ ہوتی، بفرض محال ہوتی بھی تو میں قصۂ زمین بر سرِ زمین کا حکم پوری قوتِ سیاسی کے ساتھ نافذ کر دیتا۔ میرے خیال میں محض اسکولوں کے "بچے"، کالجوں کے طالب علم تمام قصباتی و شہری مدارس کے معلمین، ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کے

اراکین، آنریری مجسٹریٹ اور منصف، مخطوب و مسنّد افراد، راجگان، اور تعلقداران، اعزاز سرکاری کے متلاشی اصحاب اور تنخواہ پانے والے حضرات جشن صلح منانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہیں، آپ خود بتائیے اس قدر بے شمار تعداد کے شامل ہو جانے کے بعد ہندوستان میں باقی ہی کون رہتا ہے؟ محض چند خود سر، ناعاقبت اندیش، گرم دماغ والے ..... نوجوان جو کہہ سکتے ہیں سب کچھ مگر کر کچھ نہیں سکتے۔

مجھے جمائیاں آنی شروع ہو چکی تھیں، آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت بڑھتی جاتی تھی۔ اشیاء گرد و پیش خود بخود نظر آ جاتی تھیں مگر دھندلی دھندلی۔

میں ہمیشہ پورے غور کے بعد اس فیصلہ پر پہونچا ہوں کہ محض میری عدم موجودگی دنیا کے اکثر اہم معاملات میں نہایت نقصان رساں ثابت ہوئی ہے، اور کچھ نہیں۔ اگر مجلسِ واضعِ قوانین کی باگ میرے قبضۂ قدرت میں ہوتی تو یقیناً ایسے لچر قوانین کا وجود باقی نہ رہتا جو چوری کے بعد بھی سینہ زوری کا موقع بہم پہونچا سکیں۔ ایسے ضابطہ کا نام و نشان بھی نہ ہوتا جس کے بل پر مرتکب جرم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بحث کر سکے۔ ایسے عمل طویل کی ہستی بھی نہ رہتی جس کی وجہ سے حکم آخر کی اپیل تو درکنار نظر ثانی بھی ممکن ہوتی۔ عدالت کا وقت بچتا، فریقین کا روپیہ بچتا، جرائم کا استیصالِ مستقل ہو جاتا، طبقۂ مُشیر قانونی پر انکم ٹیکس بڑھانے کی ضرورت نہ پیش آتی؛ سزایاب ہونے والے مجرم

ٹھنڈے پیٹوں سزا کاٹ کر سبکدوش ہو جاتے، تین مہینے کی سزا کے لئے سال سال بھر کی حوالات، تحقیقات کی تکمیل اور طوالت آمیز طریقہ معدلت گستری کے بدولت نہ بھگتنی پڑتی، بشیک دنیا ..... میں ..... بڑا ..... امنِ مستقل ہوتا ..... ضرور ہوتا۔ میری دونوں آنکھیں اب غالباً کھولنے سے بھی نہ کھل سکتی تھیں ....



مجھے معلوم ہوا کہ میرے کھانے کے کمرے میں کچھ دال میں کالا ہے، کھٹکے کا شبہ ہوتے ہی بڑی جواں مردی اور شانِ افتخار کے ساتھ اُس آہٹ کی گوشمالی کرنے چلا، غالباً وہ آہٹ میری آہٹ پا کر، میرے کمرہ میں داخل ہونے سے پیشتر کھانے کی میز کے نیچے دبک چکی تھی، میز کی بالائی حالت بہت کچھ ایسی ہو چکی تھی جیسی وارسا کی جنرل ہنڈنبرگ کے ہاتھوں ہوئی تھی، رکابیاں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں، گلدان کروٹیں بدل رہا تھا، نمکدان چاروں شانے چت تھا، دودھ دان زمیں بوسی کی بدولت ضرب شدید کا مزہ چکھ رہا تھا اور میز کی چادر دفعتاً تارپیڈو پھٹ جانے والے سمندر کی سطح کی مانند چیں بجبیں تھی۔ سفید براق چادر کے مشاہدہ قریب سے اُس "آہٹ" گرد آلود نقوشِ پا معلوم ہوتے تھے، فنِ سراغ رسانی کی مہارت کی بدولت آنِ واحد میں ثابت ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہ آہٹ از قسم حیوانات ہے اور چارپایہ ہے تجربات و مشاہداتِ دیرینہ پوری طرح ثابت کرتے ہیں کہ ایسی جرائم پیشہ مخلوقاتِ چارپایہ کی تادیب کے لئے

عصائے موسوی کی ذریات، جو بھاری بھرکم "تنبیہ الغافلین" سے نازک اندام "مشغلۂ دستی" تک ہر قد و قامت کی ہو سکتی ہے۔ نہایت زود اثر اور سبق آموز آلۂ سرزنش ہے۔ میں الٹے قدموں باہر آیا اور ایک کونے سے اپنے خدمت گار کی لاٹھی اٹھا کر پھر اندر جھپٹا۔ وہ سرقہ شعار ہستی دبے پاؤں میز کے نیچے سے برآمد ہو کر راستہ ناپنے کی فکر میں تھی کہ میں اس کے سر پر ایروپلین کی طرح چھا گیا۔ اب وہ پسپا ہوتے ہوتے دیوار میں پیوست ہو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ قریب پہونچنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک کالا کتا تھا۔ وہ دیوار میں پچی ہوتا جاتا تھا اور نہایت لجاجت و خوف کے ساتھ میری طرف اسی طرح دیکھ رہا تھا جس طرح آج کل سلاطینِ مغلوب پریسیڈنٹ وِلسن کا منہ تکتے ہیں۔ اس کیفیتِ فتحمندی کا مزید لطف اٹھانے کی غرض سے میں بےساختہ اس سے مخاطب ہوا "کیوں بے چور، بدمعاش، اب بتا؟" خدا جانے اُس کو قوتِ ناطقہ حاصل ہو گئی یا میں اس کی بولی سمجھنے لگا۔ جو کچھ بھی ہو۔ میں نے اپنے جواب میں سُنا۔ "جان کی امان پاؤں تو بتاؤں۔"

"جا تیری جان تجھے بخشی! اب بتا۔" کہتے ہوئے میں نے لاٹھی کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔

وہ۔ "جہاں پناہ۔ میں نہ چور ہوں نہ بدمعاش، میرا سلسلہ نسب ڈھائی سو واسطے سے ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جو اپنی تمام عمر اصحابِ کہف کی موردِ عنایات و مراہم رہی۔"

میں۔ "مجھے آپ کا حسب ونسب دریافت کرنا نہیں ہے۔"

وہ۔ "لیکن جناب اس قسم کی تمہید ہر التجا کا ضروری جزو ہے۔ خود آپ کی سرکار عالیہ ہر خواہانِ خطاب و اعزاز یا امیدوار ملازمت سے اپنے آبا و اجداد کی سوانح عمری کا لبّ لباب سننا پسند کرتی ہے۔ اس کا اظہار ضروری سمجھا جاتا ہے کہ ملتجی کا باپ رائے بہادر، بھائی آنریری مجسٹریٹ ماموں میونسپل کمشنر، چچا اپنے قصبہ کا وفادار سرغنہ یا نمبردار، اور ماں لارڈ رابرٹس کے اردلی کی اکلوتی بیٹی تھی جو جنگ افغانستان کے دوران میں درہ بولن میں پیدا ہوئی تھی......"

میں (بات کاٹ کر) "میں آپ کی شانِ نزول دریافت کرنا چاہتا ہوں؟"

وہ۔ "میرے آنے کی وجہ محض شدّتِ جوع اور کمیابی غذا، پیٹ کی آگ بجھانا جاندار کا پہلا فرض ہے، میں انسان کی طرح اپنے پیٹ کو ذخیرہ لذائذ، حیوانات کا عجائب خانہ یا محکمہ کمسریت کا گودام نہیں بنانا چاہتا ہوں۔ محض اس خواہش فطری کو رفع کرنا چاہتا ہوں جو قدرت نے بلا میرے صلاح و مشورہ کے میرے سر منڈھ دی ہے۔"

میں۔ "لیکن تم کو میری چیز کے ناجائز طور پر ہضم کر جانے کا کیا حق ہے؟"

وہ۔ "وہی جو انسان خود غرض کو تمام دنیا کی نعمتوں، فوائد اور حقوق کو اپنی ذات کے لئے مخصوص کر لینے کا ہے، انسان نے باوجود حیوان ہونے کے۔ تمام دیگر حیواناتِ عالم پر دنیا کی نعمتوں کا دروازہ بند کر دیا، بڑھتے بڑھتے اب خود اس پر وہی دروازہ دوسرے انسان بند کر دینا چاہتے ہیں،

اگر یہی لیل و نہار رہے تو مستقبل قریب میں سبوس گندم بقدر ۳ تولہ محض برائے رفع نزلہ روغن زرد بقدر حاجت برائے آشوب چشم، پارچۂ سفید حسب قدو قامت بغرض کفن، اور کاغذ
استعمال جائز کا دائرہ آپ نے بہت تنگ کر دیا ہے۔ اس کی تعریف وضع کرنے میں بھی میری رائے کو دخل نہ تھا۔ کیا اچھا ہو کہ آئندہ جنم میں آپ سگِ سیاہ ہوں اور میں انسانِ سفید۔"

میں - تناسخ کا میں قائل نہیں، کوئی معقول وجہ تم اپنے مداخلتِ بیجا کی نہیں بتا سکتے؟"

وہ - "مغلوب ہستی کبھی کوئی معقول وجہ نہیں بتا سکتی۔ بیچارہ مرغ بھی اذان دینے کی کوئی معقول وجہ گربۂ مسکین کو نہ بتا سکا تھا۔ کیوں کہ مغلوب ہو جانا ہی سب سے بڑی نامعقولیت ہے۔"

میں - "اسی کا نام جہالت ہے، سرقہ کا ارتکاب اب تم سے ہو چکا۔ اب اس کی سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ - "سرقہ کی تعریف جو آپ کا خانہ ساز قانون بتاتا ہے۔ اس کو نہ میں تسلیم کرتا ہوں اور نہ وہ افرادِ انسانی جو اس فعل مردانہ کو دیگر پیشہ ہائے حصول رزق کی طرح اختیار کرنے پر مجبور رہیں، گرانیٔ اجناس، قحط پارچہ، مفقودی سیم و زر ان مصائب کا باعث وہ مجبور افراد ہیں یا آپ با اختیار حضرات؟ ان بیچاروں کے لئے صرف دو راستے کھلے ہوئے ہیں یا تمام عمر آپ حضرات کے لات گھونسے اور اس کے معاوضہ میں سوکھے ٹکڑے کھایا کریں، اور یا مردانہ وار خود غرض

غاصب کی جمع کی ہوئی دولت کو کسی نہ کسی طرح چھین لینے کی کوشش کریں، اس غلامی کو آپ کا قانون عزت کی زندگی رکھتا ہے اور اس مردانہ جوش انتقام کو سرقہ اور ڈکیتی سے تعبیر کرتا ہے۔"

میں "گویا تمھاری رائے میں تفریق مراتب ہی دور کردی جائے۔"

وہ "بیشک اسی تفریق مراتب نے آج تک تمام دنیا میں مستقل امن قائم نہیں ہونے دیا؛ خود بینی، خود غرضی، خود رائی اوران پیدا ہونے والی نامتناہی ہوسِ جاہ، اسی تفریق مراتب کی بار آور شاخیں ہیں جو آئے دن کشت وخون کا بازار گرم رکھتی ہیں، آج حیوانی ہمدردی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا اگر یہ لغو تفریق مراتب حائل نہ ہوتی؛ زر، زمین، زن اس فساد انگیز تفریق مراتب کے تین پاؤں ہیں۔ یہ سراپا یہ چیز تمام مخلوقاتِ عالم کو جن میں دو پایہ سے ہزار پایہ تک سب ہی قسم کی مخلوق شامل ہے۔ امن سے زندگی بسر نہیں کرنے دیتی۔"

میں "بالکل لغو، غلط روی عنصر کی تادیب کے لئے ہمیشہ ایک بالاتر طاقت کی ضرورت ہے؛"

وہ "محض اس وقت جب کہ قلیل تعداد بہ زور کثیر تعداد کو اپنے پسندیدہ راستہ پر چلانا چاہتی ہو؛ کل تعداد کی مجموعی پسند شمار زندگی قرار پانے پر طاقت بالا ایک فضول شے رہ جاتی ہے۔ فی الحقیقت جس زمانے سے انسان نے اپنی سرشت اصلی سے یا بہ الفاظ دیگر، حیوانیت سے گریز کی اسی وقت سے تفریق مراتب کی ہوا اس کے سر میں سمائی، پہلے وہ حیوان کے مارنے اور

قبضے میں لانے کے لئے طرح طرح کے ہتیار اور جال بناتا اور استعمال میں لاتا رہا اور اب خود انسان کو قتل کرنے اور غلام بنانے کے لئے نت نئے آلاتِ حرب اور قوانینِ سخت ایجاد کرتا اور کام میں لاتا ہے۔ پہلے وہ کالے کتّے کو نجس اور ذلیل جانتا تھا۔ اب کالے آدمی کو اُس سے بھی زیادہ ذلیل مانتا ہے!"

میں "تم اب بھی میرے دعوے کو تسلیم نہیں کرتے تو ایک دوسرے شخص کو ثالث بنالو۔ اگر وہ بھی کہہ دے کہ تم سے سرقہ کا ارتکاب ہوا، پھر تو مانو گے؟"

وہ ۔ "ایک نہ شد دو شد، ثالث بھی ایک دوسرا انسان، جناب من۔ دنیائے قدیم "عید کے پیچھے ٹر" اور "برات کے پیچھے دھونسہ" مانتی تھی۔ دنیائے جدید "مار کے بعد سنوارا" اور "مارشل لا کے بعد تحقیقاتی جماعت" ماننے والی ہے۔ آپ میں اور دوسرے انسان میں سگِ زرد اور شغال کی نسبت سے ہے۔ آپ میں اور کسی دوسرے انسان میں میرے نقطہ نگاہ سے زیادہ سے زیادہ فرق ہو سکتا ہے تو ایسا ہی جیسا "اوڈائر میں اور ڈائر میں۔"

مجھے اس کی جہالت آمیز تقریر پر اب غصہ آچلا تھا، وہ میرے ہاتھ میں ڈنڈا ہونے کے وقت اس قدر دلیر نہ تھا جیسا اب ہو گیا تھا، گویا ٹر کی کی طرح وہ زمانۂ جنگ میں اس قدر تکلیف دہ نہ تھا جس قدر صورتِ صلح میں، ایسے افراد کا وجود بقیہ کتوں کے لئے مثال بد تھا۔ خدانخواستہ اگر سب پر جہالت آمیز جن سوار ہو جائے تو ایک دن میرا وفاشعار و جاں نثار کتّا "ڈھگا" بھی گولی مار دینے کے قابل ہو گا۔ اس کا استیصال میرا

فرضِ اخلاقی تھا۔ میں "بس بہت بھونک چکے" کا اعلانِ جنگ دیتا ہوا اپنے "مولا بخش" کی طرف مڑا، وہ ایک جست میں پھر میز کے نیچے تھا۔ میں نے لاٹھی میز کے نیچے کھٹکھٹائی کہ وہ باہر نکلے! اس نے غرانا شروع کیا گویا وہ مجھے دھمکاتا تھا۔ اب میرے غصہ کا پارہ ۸۰ ڈگری سے اوپر نکل گیا! اس کی پرچھائیں سی میز کی دوسری جانب مجھے نظر آئی، جھٹ کر پوری طاقت سے ایک ہاتھ مارا، خدا جانے اس خبیث کے لگا یا نہیں مگر میز کے ایک کنارے پر اڑتا ہوا ضرور پڑا، میز کی تمام بالائی سطح "جلیانوالہ باغ" کا کرشمہ دکھانے لگی، پلیٹوں میں غدر برپا ہو گیا، گلدان ربڑ کی گیند کو مات کرنے لگا، نمکدان "ہے آخر موت" کا قائل ہو چلا اور لیمپ چشم زدن میں چراغ پا ہو گیا، اندھیرے میں مجھے اس کی کمرے سے باہر جانے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ میں طیش میں بھرا پیچھے دوڑا۔ میز کے پائے سے ٹھوکر کھائی، ایک کرسی سے الجھا، اور دھڑام سے منہ کے بل ....

آنکھ جو کھلی تو آرام کرسی سے اچھل کر یا پھسل کر، آدھا زمین پر آ چکا تھا، میرا قلب پنجاب میل کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اور میرا جاں نثار کتا "ڈھگا" میری کرسی کے چاروں طرف دوڑ کر بھونک رہا تھا اور بظاہر محوِ حیرت تھا۔

میں لاحول پڑھتا، آنکھیں ملتا، پائپ ہاتھ میں لئے اٹھا اور دل

دل میں سوچنے لگا :۔

"چُو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد"



عالم ارواح

عالمِ ارواح

مجھے بذات خود اس کے تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ واقعہ بظاہر ناقابل قبول نظر آئے گا، لیکن دنیا کے ہزاروں صحیح واقعات اکثر ذی فہم اشخاص کی نظروں میں لغو معلوم ہوا کرتے ہیں، ایسے شبہ کو زیادہ سے زیادہ ایک رائے سلیم سمجھ لیا جائے، مگر اس سے اصل واقعہ کے امکان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ریوٹر مدفیوضہ کے تاروں اور سچّی خبروں کو بڑے بڑے تعلیم یافتہ لغو سمجھتے رہے، مگر اس سمجھنے سے جنگ عظیم کے واقعات پر کچھ اثر نہیں پڑا اس وقت گوپامئو شریف میں مزار کے متعلق بڑے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ وہ کم و بیش دس سال کی مدّت میں دس گز کے قریب جانب مغرب سرک گیا ہے، اور اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں گوپامئو کے کسی سلیم الطبع باشندے کو اس قدر بھی تامّل نہیں جس قدر مہاتما گاندھی کو سوراج بذریعہ ترک موالات ملنے میں ہوگا۔ اس سے بحث نہیں کہ مزار مذکور ۵۰ سال کے عرصہ میں حدود گوپامئو کو طے کر جائیگا، یا ایک صدی میں اَوَدھ کو پھلانگ کر صوبہ متحدہ میں پہونچ جائے گا۔ بہر حال یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ وہ دس سال میں دس گز سرک گیا؛ واقعات کی خوبی صرف یہی ہے کہ وہ واقع ہوئے ہیں۔ منطق سے ثابت کیا جانا علم تاریخ کا کوئی جزو نہیں؛

ماننا یا نہ ماننا سننے والی کی ہمّت پر منحصر ہے۔

جہاں تک دریافت ہو سکا ہے، مرزا یاور حسین کی عمر ۱۸ سال کچھ مہینے کی تھی جب اپنے والد ماجد کے انتقال پر وہ تمام کاروبار کے مالک قرار پائے "مرزا اینڈ کو" کے نام سے موسوم ہونے والی سگرٹ وغیرہ کی مشہور دکان معہ اپنے بیش بہا منافع کے یاور حسین کو ترکہ میں پہونچی۔ چند ماہ کے لیے ترک فرائض کی نصیحت، تجربہ کار ڈاکٹروں نے غم غلط کرنے کی غرض سے، تبدیل آب و ہوا کے اصول پر، کی۔ مشورۂ طبّی میں چون چرا کی گنجائش نہیں! یاور حسین کو تھوڑے عرصہ کے لئے ترکِ کاروبار کرنا پڑا، گرمی کا موسم، ڈاکٹر کی ہدایت، یاور حسین نے مسوری کا رُخ کیا۔ غالباً مسُوری کی آب و ہوا متمول والدین کی پسماندہ اولاد کے دماغ سے اس صدمہ کو دور کرنے کے لیۓ اکسیر کا حکم رکھتی ہے جو ایسی نوجوان اولاد کو اپنے والدین کے رخصت ہو جانے یا متاعِ کثیر کے ہاتھ آنے سے پیدا ہوتا ہے!

"یاور حسین کو تعلیم نے کس کس حیثیت سے سُدھارا؟" صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا۔ مگر ایک اثر مستقل تھا اور ہویدا تھا۔ خَیرُ النّاس مَنْ یَّخدِمُ النّاس کو نہ صرف باور مانتا تھا بلکہ فطرتاً اس پر عامل رہا۔ فطرتاً اس لئے کہ اس کے بچپن کے کارنامے بھی اسی رنگ میں ڈوبے نظر آتے تھے۔

ساڑھے تین سال کی عمر میں وہ ایک بڑے حوض میں غوطہ کھاتا ہوا بہ دقّت

تمام نکالا گیا جہاں وہ اپنی رائے میں ایک مینڈک کے بچّہ کو تیرنا سکھانے کے لئے کودا تھا۔ پانچ برس کی عمر میں اسی کی انگلی کا مستقل علاج محض اس وجہ سے کرنا پڑا کہ وہ ایک شہد کی مکھی کو ایک ننّھے مُنّے پھول سے اُٹھا کر ایک اچھے اور زیادہ شیریں پھول پر بٹھانا چاہتا تھا، اُسی زمانہ میں اس کی ایک آنکھ کو دیرپا صدمہ برداشت کرنا پڑا کیوں کہ وہ اپنی بلّی کو ہزار ہزار طرح سے یہ سکھانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ننّھے ننّھے بچّوں کو بغیر مُنہ میں دبائے کس طرح ایک جگہہ سے دوسری جگہہ لے جائے، دوسروں کا کام کرنے میں اُسے ہمیشہ اسی قدر لطف آتا تھا جس قدر ایک موجودہ لیڈر کو قومی کام میں آتا ہو، اسکول میں بھی وہ کبھی اپنی ہم جماعت طلبار کی امداد سے غافل نہیں رہا، جو سوال استاد بولتے، وہ اکثر سب سے پہلے نکال لیتا اور خود پورے اصرار کے ساتھ تمام طلبا کو نقل کرا کے مانتا۔ اب یہ محض اتفاق سمجھیے یا بدقسمتی کہ وہ سوال ہمیشہ غلط ہوتا اور "مرگِ انبوہ جشنے دارد" کا لطف ساری جماعت کو یکساں اُٹھانا پڑتا۔ اس کا فیضِ عام عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا اور ارتقا کے منازل طے کرتا رہا۔ چودھویں یا پندرھویں سال میں وہ محلہ بھر کے تمام نفوس کی امداد کے لئے بدل و جان تیار رہتا تھا، اکثر و بیشتر محلہ والوں کے خطوط نویسی میں وہ اپنا عزیز وقت صرف کیا کرتا، خط کا مضمون حرف بحرف لکھوانے والے کے حسبِ منشا لکھنے میں گھڑیوں محو رہتا۔ البتہ ۹۵ فیصدی مکتوب الیہ کا پتہ غلط ہو جانے کے باعث خطوط زیادہ تر کسی شخص کو ملنے کے بجائے

ڈاک خانہ کے مہمل قواعد کی بدولت چاک کر دیئے جاتے۔ بارہا ناواقف ہمسایوں کے سفر کرنے کے موقعہ پر وہ خود اُن کو پہنچانے اسٹیشن پر گیا، اس نے خود اسباب تلوایا، خود ٹکٹ لئے، خود قلیوں کو چکایا، خود تمام زحمت اُٹھائی اور اس وقت تک مطلق دم نہ لیا جب تک بیچارے ناواقف مسافروں کو پورے اطمینان اور کافی عرق ریزی کے ساتھ غلط ٹرین میں سوار نہ کرا دیا۔ کسی عمل کا نتیجہ خاطر خواہ ہونا یا نہ ہونا۔ مقدر سے تعلق رکھتا ہے؛ اس سے عمل پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ جو کچھ بھی ہو یاور کے خلوص اور نیک نیتی میں چوہے کے بچے کو بھی شبہ نہ تھا۔ اگر وہ طوفان نوح کے زمانہ میں موجود ہوتا تو یقیناً حضرت نوح کی کشتی تیار کرنے میں اپنی ساری عمر بخوشی صرف کر دیتا، اب یہ ایک قطعی دوسری بات ہے کہ وہ کشتی پہلے ہی روز امواج میں تحت الثریٰ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر لیتی۔ بہر حال، ایثار، خلوص اور نیک نیتی کے لحاظ سے اُس کی ذات میں وہ تمام اوصاف تھے جو ایک لیڈر میں ہونے چاہئیں۔

ہاں۔ اب والدِ سرپرست کے والدِ مرحوم بن جانے پر اُسے اپنی خدمات کے اظہار کا خاطر خواہ موقع ہاتھ آگیا۔ مرزا غالب متاعِ بُردہ کو رہزن پر اپنا قرض سمجھتے تھے۔ مرزا یاور متاعِ صرف کردہ کو تمام جہان پر اپنا دَین مانتے تھے۔ ایسے خیالات کے ساتھ مسوری کی سرزمین نت نئے شگوفے کھلانے کے لئے نہایت موزوں تھی، راوی کا بیان ہے کہ یاور حسین نے اپنے اُنیسویں سال میں ٹھیک اس وقت قدم رکھا جب وہ مسوری پر

"اسکیٹنگ رنک" میں پھسلنے والی چلبلی صورتوں، یا ناچنے والی تیتریوں کے نظارہ میں قطعی محو تھے۔ گزشتہ ۱۰ سال کی مدت میں شادی کا خیال کئی مرتبہ کسی پیاری صورت سے دوچار ہو جانے پر آیا مگر ہمیشہ اسی بنا پر دماغ سے دھکے دے کر نکال دیا گیا کہ شادی کا فعل از سرتاپا خودغرضی پر منحصر نظر آتا تھا، ایک روز یاور نے اپنے بنگلہ کے احاطہ سے ایک خوبصورت بھولی بھالی، لڑکی کو سامنے والی ناہموار پہاڑی پر دو چھوٹے بچّوں کے چڑھانے میں مصروف دیکھا، وہ بے تحاشا امداد کے لئے دوڑے، دونوں بچّوں پر چیل کی طرح جھپٹّا مارا اور دونوں کو اپنے کندوں پر اُٹھا کر فوراً پہاڑی کے اوپر پہونچا دیا۔ اس حرکت نے اُس بھولی بھالی لڑکی کو، جس نے اپنے تناسب اعضا کے نشیب و فراز کے ڈھالنے میں ابھی تک تیرھاں ۱۳ برس صرف کئے تھے، بہت کچھ خائف کیا، مگر گفتگو نے اُس خوف کو احساس منت میں بدل دیا۔ یاور حسین نے بہرصورت، ان تینوں کو ان کے مکان تک پہونچا کر پیچھا چھوڑا، ان بچّوں کے والد بزرگوار اپنے گھر بار کو لئے مسوری پر گرمی کاٹنے آئے تھے۔ مرزا یاور حسین سے اسی روز ملاقات ہو گئی، جس روز یہ اُن کی حسین لڑکی کو پہنچانے اُن کی فرودگاہ تک پہنچے۔ معمر شخص کی نگاہ نے یاور کے قیافہ سے اور گفتگو سے بہت کچھ بھانپ لیا اور یاور حسین سے ربط ضبط بڑھانا مناسب سمجھا۔ دو مہینے کی مدّت میں بیسیوں مرتبہ یاور حسین نے اُن کے ہاں چائے نوشی کی اور اُنھوں نے یاور حسین کے ہاں دعوت کھائی، ان بزرگوار کا نام مرزا عاقل بیگ تھا،

اور ان کی لڑکی کا نام مہ پارہ بیگم تھا، مہ پارہ بیگم سے لے کر حسن آرا بیگم
تک جو سب سے چھوٹی تھی، ایں قدر و آں قدر۔ پوری سات لڑکیاں رکھنے
کا فخر مرزا عاقل بیگ کو حاصل تھا، اس بچھیر اپلٹن کے مستقبل کی فکر مستقل
طور پر عاقل بیگ کے دماغ میں چکر لگایا کرتی تھی؛ ممکن ہے کہ اُسی فکر
نے یاور حسین کے ساتھ پینگ بڑھانے کا خیال پیدا کیا ہو؛ اِدھر
یاور حسین کو علم ہو چلا کہ عاقل بیگ کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے اکثر متفکر
رہا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں عاقل بیگ کی امداد یاور حسین کا فرض اولیں
قرار پایا؛ سب سے پہلے بار بار سر ہو کر عاقل بیگ کو اپنے بنگلہ میں شریک
ہو جانے پر راضی کر لیا گیا اور اس طرح آنے جانے کی زحمت کے علاوہ
دُہرا کرایہ مکان بھی بچ گیا، مہ پارہ بیگم ایک بھولی بھالی، ناتجربہ کار،
کمسن لڑکی تھی؛ یاور حسین دوسری کی خدمت کرنا اپنا مقصدِ حیات بنا چکے
تھے، نتیجہ لازمی یہ تھا کہ وہ محض عاقل بیگ کی امداد و سبکدوشی کی خاطر
مہ پارہ بیگم سے عقد کر لیں، اس شادی کی بنیاد قطعی ایثار نفس اور نیک نیتی
پر تھی، لہٰذا فوراً عاقل بیگ سے تحریک کی گئی، معمّر شخص نے گرم و سرد زمانہ
کا تجربہ بہت کچھ حاصل کیا تھا، ایسی سونے کی چڑیا پھانسنے میں اُسے کیا
حجت ہو سکتی تھی، مختصراً قیام مسوری کے تیسرے مہینے میں یاور حسین
نے مہ پارہ بیگم سے خالص ایثار و نیک نیتی کی بنا پر عقد کر لیا:
اس بھاری بوجھ سے سبکدوش ہو جانے پر اور اس خیال سے کہ دولھا
دُلہن کو تنہائی، اور خلوت کی زندگی میں محبّت باہمی کے مضبوط کرنے کا

موقع مل سکے، عاقل بیگ نے پہلے ہی ہفتہ میں مسوری سے کوچ کیا اور
اور اپنی آدھی درجن جنس نازک کا سرمایہ ساتھ لئے نیچے اُتر آئے، یاور و
مہ پارہ فی الحقیقت کمسن و ناتجربہ کار تھے؛ اُن کی شادی گُڈّے گُڑیا کے
بیاہ سے زیادہ وزنی نہ تھی۔ تیرہاں برس کی لڑکی اور ۱۹ برس کا لڑکا،
ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت سے کورے تھے۔ ایک نئی لذّت آمیز زندگی کا راز دونوں
پر کھُل جانے پر باہمی کشش اُسی حد تک پیدا ہوگئی تھی جس حد تک فطرتاً اُس
جذبۂ لذّت آفریں کے جذبۂ جدید سے ہوسکتی تھی؛ ایسی رغبتِ باہمی جو محض
تکمیلِ لذّت پر مبنی ہوتی ہے۔ دیرپا محبّت اور اس کے گہرے نقوش سے
عملاً بالکل بیگانہ ہونی چاہیئے، اور تھی۔ دراصل شادی ہوجانا ایک بچپنہ کا
دماغ کی رائے میں اس قدر جلد وجود میں آگیا تھا جس قدر جلد جنگ
یورپ کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ دونوں طبائع اتصالِ مستقل کے لئے بالکل
موزوں تھیں، البتہ تکمیل کسی قدر قبل از وقت تھی۔ یاور و مہ پارہ کے
دماغوں میں ابھی تک بچپن اور اُلھڑپن بہت کچھ جاگزین تھے۔ ہفتہ عشرہ
ہی گذرا تھا کہ نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر دونوں طبیعتوں نے غلط فہمی
اور بالک ہٹ کا اظہار شروع کردیا۔ سب سے پہلے جو ناقابل معافی خطا
جو یاور سے سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ اُس نے محض مہ پارہ کو خوش
کرنے کی غرض سے اپنے عرصۂ دراز کے مونس حقّہ کو ترک کردیا۔ مہ پارہ
کو اس کے مُنہ سے بعض اوقات۔ غالباً دہانہ سے دہانہ متصل ہوجانے پر
تمباکو کی بو آتی تھی، لہذا یاور نے ہمیشہ کے لئے تمباکو نوشی سے توبہ کرلی،

تمباکو، حکمت کے نقطۂ نگاہ سے کیسا ہی کلیجہ جلانے والا یا پھیپھڑا پھیدنے والا کیوں نہ ہو، لیکن، مونسِ تنہائی ضرور ہے! اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھتا ہے اور عادی ہوجانے کے بعد یک لخت چھوڑ دیئے جانے پر دماغ میں ایسا چڑچڑاپن پیدا کر دیتا ہے. جیسا رمضان شریف کے متبرک مہینے میں صائم حضرات میں اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے. ترک تمباکو نوشی نے یاور کے دماغ پر جو کچھ کرشمہ کیا وہ درکنار جسم پر بھی عجیب عجیب اثرات پیدا کیے. روزانہ صبح کو کافی عرصہ تک یاور حسین کو انگڑائیوں اور جمائیوں کی باقاعدہ ورزش کرنی پڑتی تھی اور اکثر اوقات یہ ورزش بلا ارادہ مہ پارہ کی موجودگی میں شروع ہوجاتی تھی. مہ پارہ کو اس منہ پھاڑنے والی ورزش جسمانی سے سخت نفرت تھی، وہ یاور کو بعض دفعہ ترش روئی کے ساتھ ٹوکتی اور یاور ایسے چشم و ابرو سے مکدّر ہوتا، کبھی یاور کی امداد آمیز افعال مہ پارہ کو حماقت معلوم ہوتے اور اس کا اظہار یاور کو جہالت نظر آتا، کبھی مہ پارہ کی صاف گوئی یاور کو گستاخانہ دلیری معلوم ہوتی اور اس خیال کا اظہار مہ پارہ کو مردوں کی زبردستی نظر آتا، ایک دن مہ پارہ نے یاور کو اپنی زلفوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے کچھ چیں بجبیں ہو کر روکا اور یاور نے کمرے سے باہر جاکر زمین و آسمان کو شاہد بنا کر، ان زلفوں کو چھونے کی قسم کھالی. دراصل یاور حسین کا خیال تھا کہ شادی ہوجانے کے بعد "دُولہا ہی چین لکھتا ہے"! اور وہ ایسا نہ ثابت ہونے سے حددرجہ مایوس تھا. چھوٹی چھوٹی باتوں

پر بجائے خود خیالات کی عمارت بلند قائم کیا کرتے اور گھنٹوں خواہ مخواہ سوچ سوچ کر میں کا بیل بنایا کرتے، کوئی تجربہ کار شخص نگراں ہوتا تو یقیناً ان دونوں اُلھڑ دماغوں سے ان فضولیات کو دھوتا رہتا مگر ایسا نہ ہونے پر ہر ایک اپنی مہمل خودداری پر خلیج غلط فہمی کو اور زیادہ وسعت دیتا جاتا تھا؛

ایک مرتبہ رات کے کھانے میں یاور حسین کو نمک بے حد پھیکا معلوم ہوا، مہ پارہ پر بے پروائی کا جرم عائد کیا گیا، اس کو اپنے ارتکابِ جرم سے انکار تھا۔ بات بڑھی؛ یاور نے عورتوں کو ناقص العقل ثابت کرنا چاہا۔ مہ پارہ نے مردوں کو ہٹ دھرم اور احسان ناشناس ٹھہرایا۔ گفتگو میں ترشی پیدا ہوئی اور غصہ کا جن دونوں کے سر پر سوار ہو گیا۔ یاور حسین نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، رکابی اٹھا کر پھینک دی، سالن مہ پارہ کے سینہ پر گرا اور رکابی سر میں لگنے سے بال بال بچ گئی۔ اب کیا تھا؟ مہ پارہ نے کھانا میز پر چھوڑا اور اپنے کمرہ میں گھُس کر اندر سے کواڑ بند کر کے کنڈی لگالی! یاور حسین بھی جھپٹے مگر کواڑ بند ہو چکے تھے۔ ہزار ہا کوشش پر بھی اندر داخل نہ ہو سکے۔ رات بھر میں مہ پارہ نے رو رو کر آنکھیں سُجا لیں اور یاور نے ساری مسوری کا گشت لگاتے لگاتے پیر سُجا لیئے۔ اِدھر سورج نِکلا اُدھر مہ پارہ اپنے کمرہ سے برآمد ہوئی، یاور حسین نے ارادہ معافی مانگنے کا کیا تھا مگر عین موقع پر جو کچھ کہا اس کا منشا یہ تھا کہ فی الحقیقت مہ پارہ قصوروار تھی اور اس قصور پر غصہ آجانا قطعی ناجائز

نہ تھا، رات کے فاقہ نے معدہ کے علاوہ دماغ کو بھی نقطۂ انتہائی تک گرادیا تھا۔ پھر بحث چھڑی اور بُری طرح چھڑی۔ تمام طباعی اور منطق مہمل و طفلانہ الزامات کیے ثابت کرنے میں صرف کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مہ پارہ بیگم نے اپنا اسباب باندھا اور یاور حسین نے اپنا۔ دونوں شام ہونے سے پیشتر دہرہ دون میں اُتر آئے۔ مہ پارہ پہلی ٹرین سے اپنے والد بزرگوار کی طرف سدھاری اور یاور حسین پہلے ہی گھنٹہ میں بھرتی کے دفتر میں پہونچ کر ڈسٹرکٹ رکروٹنگ افسر سے دوچار ہوئے۔ ناپ تول ہو جانے کے بعد فارم لئے ہوئے ڈاکٹر تک پہونچے اور ایک ہی دن میں بھوپال لانسر میں سوار کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے، دوسرے ہی روز اُن کو جبل پور کا پاس مل گیا اور اپنے رسالہ کی طرف چل پڑے۔ کم و بیش تین مہینے گذرے تھے کہ رسالے کے ہندوستان سے باہر میدان جنگ میں جانے کے احکامات نازل ہوئے اور بالآخر ایک روز یاور حسین کو کراچی بندر سے ۲۵ نمبر رسالہ کے ساتھ، بصرہ کے لئے جہاز پر سوار ہونا پڑا۔

عین اس وقت جب کہ جہاز سیٹی دیکر، سمندر کی سطح پر جوش پر، متحرک ہوا اور ہندوستان کا کنارہ لمحہ بہ لمحہ دور ہونے لگا، یاور حسین کو اپنی غلطی آمیز عجلت کا احساس ہوا اور عملِ حماقت بنیاد کا ردِّ عمل شروع ہوا۔ سمندر کی متلاطم اور گہرے گہرے سانس لینے والی سطح کو دیکھتے دیکھتے یاور کو اپنی تمام حماقتیں صاف نظر آنے

لگیں۔ مگر یہ سب کچھ غیر معمولی تاخیر کے بعد صورت پذیر ہوا اور اب وہ "خود کردہ را علاجِ نیست" کی طرح لاعلاج تھا۔ مہ پارہ کو بھی اپنے گھر پہونچ کر ایک مہینہ دم لے لینے کے بعد اپنی غلط روی کا علم ہو چکا تھا۔ لیکن تریاہٹ سے پیدا ہو جانے والا بُعد چند دنوں میں سطے نہیں ہو سکتا تھا۔ چارہ ناچار موقع مناسب کے انتظار میں صبر کرنا پڑا۔ مگر اس صبرِ اُمید بنیاد کی کمر ٹوٹ گئی جب عاقل بیگ کے نام موصول ہونے والے خط سے یاور حسین کے بصرہ روانہ ہو جانے کی خبر ملی۔ اب مہ پارہ اپنے کو نفریں کرنے کے لئے تیار تھی۔ دراصل اب اُسے محبّت کا احساس ہوا اور جدائی کے جذبۂ صحیح اور شوق مواصلت کو دیرپا اصولوں پر پیدا کیا۔ آٹھ دن نہ گذرے تھے کہ پانیر کے اوراق نے اُسی جہاز کے ڈبو دئیے جانے کی خبر پہونچائی جس میں ۵۲ نمبر رسالہ روانہ ہوا تھا اور غرق ہو جانے والوں کی فہرست میں یاور حسین کا نام اور نمبر صاف طور پر چھاپ دیا۔ کچھ نہ پوچھئے اس صدمۂ روح فرسا نے بھولی بھالی مہ پارہ کا دل و جگر کیسی بُری طرح پارہ پارہ کر دیا۔ یہ عمر میں سب سے پہلا زخم تھا اور سب سے زیادہ کاری تھا۔ محبّت نے اب عشق کا جامہ پہن لیا اور جدائی نے ہجر کی چادر اوڑھ لی، مہ پارہ غم کو سمجھ نہ سکتی تھی مگر خاموش تھی۔ وہ رونا نہ جانتی تھی مگر آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ وہ آہ و نالہ سے ناواقف تھی مگر دم گھٹا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ اس کی بھولی بھالی زندگی دفترِ غم کا ورقِ سیاہ بن گئی، اور اس کی پھول سی جوانی بغیر کھلے مرجھانے لگی۔

یاور حسین ایسے باحیا نہ تھے کہ جہاز کے تارپیڈو کردئے جانے پر اطمینان کے ساتھ راہیٔ ملک عدم ہو جاتے۔ انھوں نے ڈوبتے ڈوبتے بھی بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور آخر کار ایک کشتی میں بالکل بے حس و بے ہوش اُٹھا لئے گئے، غالباً اسی عجلت میں ان کا نام غرق ہونے والوں کی فہرست میں درج ہو گیا اور ریوٹر بالقابہ کے چیلے چانٹوں کے ہاتھ لگ کر شائع ہو گیا۔ وہ ہر کس و ناکس کی امداد ہمیشہ کرتے رہے لہذا قدرت نے ان کی امداد اس مرتبہ کی۔ ہفتہ عشرہ فوجی ہسپتال میں صاحب فراش رہ کر اٹھ بیٹھے اور بصرہ سے بغداد روانہ کر دئے گئے، اپنے غرق ہو جانے کی خبر جب یاور حسین کو معلوم ہوئی تو عرصہ تک ان کو بذات خود شبہ رہا کہ وہ فی الحقیقت زندہ بھی ہیں یا ان کی روح بغداد کے آثار الصنادید میں منڈلاتی پھرتی ہے۔ رفتہ رفتہ، اپنے بے تکلف ساتھیوں کی پوری توجہ اور کوشش کے بعد یاور حسین خدا خدا کر کے مُردوں سے زندوں میں آئے۔ اس کا اطمینانِ کامل۔ عقلی و نقلی طریقوں سے، ہو جانے کے بعد کہ وہ دراصل ابھی دنیا کی سطح خاکی پر خاک اڑا رہے ہیں یاور حسین کو مہ پارہ کی یاد نے ستایا۔ اس میں شک نہیں۔ اب وہ بھی مہ پارہ کے لئے بے چین تھے اور سراسر اپنے ہی کو قصور وار مانتے تھے۔ دراصل دو چیزیں اگر یکجائی کی صورت میں ٹکرانے پر آمادہ ہوں تو علیحدہ کر دئے جانے پر ان میں بجید کششِ اتصال پیدا ہو جاتی ہے، جدا ہونا مقدمہ ہے ملنے کا۔ ہجر دیباچہ ہے شوقِ مواصلت کا۔ دور ہو جانے

پر یاور حسین کو بُری طرح اشتیاقِ اتصال ستانے لگا۔ اب وہ زمین پر ہوں یا گھوڑے کی پیٹھ پر۔ مہ پارہ ان کے ساتھ تھی۔ ایک رات کو گہری نیند میں دیکھتے کیا ہیں کہ مہ پارہ ان کے سامنے کھڑی ہے، اس کے چہرے سے شکایت و شکوہ ٹپکا پڑتا ہے اور وہ بہ ہزار یاس و ناامیدی اُن سے رخصت ہونا چاہتی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اُن کے دماغ نے تعبیر دی کہ مہ پارہ غم و غصہ کھاتے کھاتے اب بیمار ہوگئی ہے اور غالباً دنیا سے چلنے والی ہے۔ اس خیال کا پیدا ہونا اور وحشت کا بڑھنا لازم و ملزم تھے۔ ارادہ کرلیا گیا کہ مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں کسی نہ کسی عنوان ملازمت سے گریز کی جائے اور جلد سے جلد ہندوستان کا رُخ کیا جائے۔ اسی جنون نے رفتہ رفتہ بیکار کرنا شروع کیا اور یہ دماغی مریضوں کی فہرست آکر پھر ہسپتال پہنچائے گئے۔ علاج شروع ہوا اگرچہ مرض لاعلاج تھا۔ اُسی زمانہ میں ایک مرتبہ پھر، سوتے سوتے دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹے سے باغیچہ میں ایک نئی قبر پر عاقل بیگ زار و قطار رو رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر بالکل صاف تھی۔ مہ پارہ بیچاری ان کی کج ادائی اور بیوفائی کا شکار ہو کر بالآخر صدمہ جانکاہ سے جاں بر نہ ہوسکی اور اسی کی قبر پر عاقل بیگ دیوانہ وار رو رہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن ط

مہ پارہ کے ساتھ یاور حسین نے نہایت ظلم کیا۔ افسوس اب کیا کیا جائے؟ ظالم کو اگر مرنا ہی تھا تو یاور حسین کے پہنچ جانے کے بعد مرلیتی، آخر کچھ مہینے

بعد عالمِ ارواح میں داخل ہوتی تو کیا اس تاخیر کے لئے ہزاروں معقول عذر تراشی سکتی تھی - کچھ بھی ہو - زندگی ہیچ ہوگئی - اب معلوم ہوا کہ واقعی ہے آخر موت ہے - بہرحال اب ہندوستان واپس ہونے کے لئے عجلت کرنی حماقت تھی - پہلے خواب نے بیمار ڈالا تھا دوسرے خواب نے اچھا کر دیا - پھر یاور حسین تھے اور ان کی کثرت فرائض - اب وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح لڑائی میں مارا جاؤں اور عالمِ ارواح میں مہ پارہ سے دوچار ہو جاؤں - مگر قسمت کو اُن سے عناد دیرینہ تھا - لڑائی ایک تار آجانے پر ختم ہوگئی اور یاور حسین نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ع ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں تو مرنے نہ دیا ؛

مہ پارا بیگم یاور حسین مرحوم کے غرق ہو جانے کے بعد سے زندہ درگور ہوگئی تھی - عاقل بیگ البتہ مردِ عاقل تھے - اُنھوں نے مہر کی نالش کی اور مہر اور حق زوجیت وغیرہ میں بڑی رقمِ کثیر یاور حسین کے چچازاد بھائی سے بزورِ قانون رکھوالی - ان کا ارادہ ایک معقول آدمی کی طرح مہ پارہ بیگم کے عقدِ ثانی کر دینے کا تھا ، مگر مہ پارہ کی نارضامندی بُری طرح سدِّ راہ تھی پورے سال بھر تمام معقول و منقول ، مناسب اوقات میں مہ پارہ بیگم کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس کی طبیعت ایسی سنگلاخ تھی کہ مطلق اثر نہ ہوا - ہر ذی فہم کا اصول عمل یہ ہے کہ جو بات معقول طور پر . . . . . صورت پذیر نہ ہو سکے تو بالآخر نامعقول طور پر وجود میں لائی جائے - مجبوراً عاقل بیگ نے بھی نامعقولات کا سلسلہ شروع کیا اور ایک بزرگ

وزنی کی طرح مہ پارہ کی مرضی کا خیال کئے بغیر. اپنے بھتیجے سے نسبت ٹھہرادی.
اگر کوئی ان کی اس حرکت کو ظلم سے نامزد کرتا تو وہ نہایت متانت کے ساتھ
فرما دیتے کہ "سلف سے یوں ہی مرے یار ہوتی آئی ہے" نسبت کی قرارداد
کے بعد البتہ یہ فکر ضرور دامن گیر تھی کہ مہ پارہ کو کسی نہ کسی طرح شادی
کئے جانے کے قابل بنایا جائے اور اس کا ناجائز و مہمل سوگ دور کیا جائے
اسی فکر نے تبدیل مقام کا خیال پیدا کیا اور موسم کے اعتبار سے پھر مسوری
پر ہی نظر پڑی ۔ مہ پارہ بیگم بھی مسوری کا نام سن کر محض اس خیال سے
راضی ہو گئیں کہ وہاں اور کچھ نہیں تو ایک مرتبہ پھر وہ مقام ہی نظر آجائیگا
جہاں یاور حسین کی آغوش محبت میں جانے کی عزت اُسے نصیب ہوئی
تھی ۔ عاقل بیگ مہ پارہ بیگم کا غم غلط کرنے مع لقبیہ اسباب افزائش نسل
مسوری سدھارے ۔

یاور حسین اختتام جنگ کے بدولت اپنی شہسواری سے سبکدوش کر دیئے
گئے، اور سبکدوش شدہ ہمراہیوں کے جم غفیر کے ساتھ، ناک کان سے
درست، بمبئی آپہنچے، ہندوستان جنت نشان کی پہلی ہوا کا جھونکا اِن
کے دماغ سے دوچار ہوا تھا کہ روشن خیالی بلا ارادہ پیدا ہو گئی ۔ اب
معلوم ہوا کہ آج تک گھر پر ان کو مردہ تصور کیا جاتا ہو گا کیونکہ خط لکھنا
تو درکنار اُس خبر کی تردید کرنے کی زحمت بھی اُنھوں نے گوارا نہ فرمائی تھی۔
ایسی حالت میں اچانک گھر پہنچنے سے چچازاد بھائی کے خوف سے مرجانے
کا اندیشہ قوی تھا۔ لہذا مناسب تھا کہ وہ دور رہ کر دو چار خط لکھیں اور

رفتہ رفتہ اپنے آپ کو زندہ ثابت کر چکنے کے بعد گھر کا قصد کریں۔ دور رہنے کے لئے پہاڑ زیادہ دلکش اور خلوت بخش معلوم ہوا۔ رات بھر اسی خیال میں گذری کہ کہاں جائیں۔ شملہ کے لئے رقم کثیر کی ضرورت تھی اس لئے وہاں جانا ناممکن تھا۔ نینی تال پر ان جیسے بزرگوار آج سے چالیس سال پیشتر "خان بہادری" کا خطاب حاصل کرنے کی سعی لا حاصل میں دفعتاً راہئ ملک بقا ہو چکے تھے اس لئے وہاں کی آب و ہوا اُن کے لئے نسلاً بعد نسلاً ناموافق قرار پا چکی تھی، المورہ کے نام سے مرض دق کا خیال پیدا ہوتا اس لئے وہاں رہنا صحت کے لحاظ سے کسرِ شان تھا لے دے کے مسوری باقی بچا، فوراً اسباب باندھ کر مسوری کا رُخ کیا اور چار روز کے اندر مسوری جا پہنچے۔

مسوری پہنچنا اور یادِ رفتہ کا زندہ ہو جانا ساتھ ساتھ وجود میں آئے۔ دل بیقرار مچلنے لگا جب اپنی پرانی فرودگاہ اور اس زمانہ کے واقعات ایک ایک کرکے حافظہ میں چکر کھا گئے۔ تہیّہ کر لیا کہ پہلی ہی شام کو جھٹ پٹے میں نظرِ خلایق سے پوشیدہ رہ کر اُس مبارک مقام کی زیارت کا شرف حاصل کیا جائے۔ معتقدات بھی اس ارادہ کی تکمیل پر مصر ہوئے۔ یقین تھا کہ مہ پارہ بیگم مرحومہ کی روح، زیادہ نہیں تو ہر جمعرات کو، ضرور اس مقام کا گشت لگایا کرتی ہوگی۔ اس یقین کو دماغ میں لئے ہوئے یا ورحسین اپنے پُرانے بنگلے کی طرف، دیکھنے والوں کی نظروں سے بچتے ہوئے، عین غروب کے وقت چلے، دل کو دل سے راہ

ہوتی ہے ، اسی لئے محبّت کی طرح حماقت بھی جانبین کے دل و دماغ میں یکساں طور پر ساتھ ساتھ پیدا ہوئی ۔ مہ پارہ بیگم بھی اپنی منجھلی بہن دل آرا بیگم ، کو ساتھ لئے بظاہر چہل قدمی کرنے ، اور بباطن اُسی پہاڑی کی زیارت کرنے ، جہاں سب سے پہلے یاور حسین نے ان کو اپنی بہنوں کے پہاڑی پر چڑھانے میں مدد دی تھی ، عین مغرب کے وقت چلیں ۔ یاور حسین بنگلے کے سامنے کسی قدر پہلے پہنچے ، خوش قسمتی سے اس بنگلہ کو کسی کرایہ دار نے اس سال نہیں لیا تھا ، چاروں طرف سنّاٹا پاکر یاور حسین کو ٹھنک ٹھنک کر ، بنگلہ کے ورانڈہ تک پہنچنے کی ہمت ہوئی ، کواڑ بند سہی مگر بالکل اندھیر اگھُپ تھا اور کوئی نشان اس امر کا نہ تھا کہ ایک انسانی ہستی اس میں قیام پذیر ہو ۔ اس اطمینان کے بعد یاور ورانڈہ کے اندر زمین پر بیٹھ گئے اور سگرٹ جلا کر عالم تخیّل میں پرواز کرنے لگے ۔ بنگلہ کا ایک گوشہ اُن کے دماغ کے ساتھ وہی کرشمہ کر رہا تھا جو بحالت موجودہ قیصر کے دماغ پر آینٹوریپ کر سکتا ہے ۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اس جگہہ مہ پارہ بیگم کے گیسو پر حملہ کیا تھا ، اس جگہہ رخسار پر چڑھائی کی تھی ، فلاں حصّہ میں مہ پارہ کو اپنے آغوش میں محصور کر لیا تھا اور فلاں کمرہ میں اس کے حُسن نوخیز پر پوری کامیابی کے ساتھ شبخون مارا تھا ۔ اُس کی نظر بلا ارادہ سامنے کی طرف اُٹھی اور اُسی تاریخی پہاڑی پر مہ پارہ بیگم کی روح ، بالکل نمایاں طور پر آہستہ آہستہ ایک طرف سے دوسری طرف ٹہلتی ہوئی نظر آئی ، آنکھیں

پھاڑ پھاڑ کر نظروں کے پیک دوڑائے گئے، ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ مہ پارہ سے یک سرِ مو بھی فرق نہ رکھتی تھی۔ یاور بے چین ہو کر وراندہ سے باہر نکل آئے، روحِ مقدس نے، ایسا معلوم ہوتا تھا، چلتے چلتے یک لخت جھجک کر ان کی طرف دیکھا۔ عالمِ ارواح کے آداب سے یاور ناواقف تھے اور اسی وجہ سے مبہوت تھے کہ اس مقدس ہستی سے کس طرح خطاب کیا جائے۔ اسی وقفہ میں ایک اور ہستی نظر آئی جو اس ہکا بکا ہو جانے والی روحِ مقدس کو کمر میں ہاتھ ڈال کر کشاں کشاں لے گئی۔ یاور کے دماغ کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں ذرا بھی توقف نہ ہوا کہ وہ دوسری ہستی بیوی مریم یا حضرت بیوی تھیں۔ دوسرے روز، دن بھر، یاور حسین عالم ارواح کے متعلق اپنے دماغ میں محفوظ ہونے والے تمام اقوال ضعیف و قوی کی جانچ و پڑتال میں سرگرداں رہے۔ سورج غروب ہوتے ہی انھوں نے اپنی جسمانی سعی و کوشش کو گزشتہ رات کی اصول پر دہرایا! اسی سنسان بنگلے کے وراندے میں، مہ پارہ کی روحِ مقدس سے دوچار ہونے کے لئے ٹھنڈی زمین پر بسیرا کیا، گھڑی بھر رات گئے پھر وہی نظارہ پیش نظر تھا، اس مرتبہ یہ تہیہ کر چکے تھے کہ اپنے مظالم و غلط کاری کا قصور اس معصوم روح سے ضرور معاف کرا لینگے تاکہ عاقبت میں اس ثقیل بار سے سبکدوشی حاصل ہو سکے۔ وہ خاموشی کے ساتھ مہ پارہ کی روح کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، روحِ معصوم بھی

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے انتظار میں ساکت اور ان ہی کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑی تھی، یہ جس قدر بڑھتے جاتے، اسی قدر اُن کے پاؤں بھاری پڑتے جاتے تھے۔ فاصلہ جس قدر کم ہوتا جاتا تھا، سانس کی رفتار بڑھتی جاتی تھی۔ لاحول سے لے کر آیۃ الکرسی تک بیسیوں آیتیں پوری تیزی کے ساتھ دل ہی دل میں برابر دہرائی جارہی تھیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالآخران کو "قَابَ قَوسَینِ اَوْ اَدْنیٰ" کا مرتبہ حاصل ہوگیا۔ اُنھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ روحِ مہ پارہ بظاہر کانپ رہی ہے۔ اس کو یہ پوری طرح سمجھ گئے کہ غصّہ میں تھرّا رہی ہے۔ یہ ندامت و احساسِ خطا سے لبریز تھے، عالمِ ارواح کے نظارہ سے ترساں تھے۔ جھٹ گھٹنے ٹیک کر اس پیکرِ روح کے سامنے عجز کے ساتھ جھک گئے۔ عالمِ قدس میں زبان ذریعۂ اظہارِ مدّعا نہیں بنتی۔ اس لئے اعترافِ خطا میں سرِ تسلیم خم کر دیا گیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ الفاظ معافی کے سننے کا انتظار کیا گیا۔ ایک غیر معمولی چیخ بیساختہ اُس پیکرِ روح نے ماری اور جسم نازنین ایک مردہ لاش کی مانند یاورحسین پر گرا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بیہوش تھے اور دو اجسام ایک ہی جگہ بظاہر مردہ ہو کر عالمِ ارواح کا گشت لگانے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂

معلوم نہیں دونوں میں سے کون پہلے زندہ ہوا اور کس قدر عقلی و نقلی دلائل کے بعد ایک دوسرے کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلانے میں

کامیاب ہو سکا۔ مگر یہ تحقیق طور پر معلوم ہو سکا ہے کہ یاور حسین و مہ پارہ اُسی جگہہ سے سیدھے دیرہ دون روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن جب یہ دونوں ڈاک گاڑی میں سوار ایک گھنٹے میں ۵۴ میل طے کر رہے تھے۔ بے چارے عاقل بیگ مسوری کے ایک ایک گوشہ میں مہ پارہ کی تلاش میں زمین کی پیمائش میں مصروف تھے۔ اگر وہ بھی عالمِ ارواح کا مشاہدہ کر چکے ہوتے تو یقیناً اُن کو یاور و مہ پارہ کا کھوج لگانے میں ایک ہفتہ غم و الم نہ برداشت کرنا ہوتا۔



اتفاقاتِ زمانہ

اتفاقاتِ زمانہ

میری تغیر رنگ پہ مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

(۱)

حمیدہ کو عبدالعزیز کے مرنے کا رنج کچھ اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ عبدالعزیز سے مانوس تھی بلکہ سچ پوچھئے تو بمبئی بھر میں حمیدہ کو نفرت دلی تھی تو صرف دو شخصوں سے۔ ایک تو مرد یعنی عبدالعزیز، اور ایک عورت، یعنی بھورے بالوں والی رضیہ۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ عبدالعزیز کی اچانک موت سے اُسے ایک عجیب پریشانی، صدمہ کے قریب قریب پہنچ جانے والی، پریشانی پیدا ہوگئی تھی، اس معمہ کے سمجھانے کے لئے واقعی اس کی ضرورت ہے کہ ہم آغاز سے آغاز کریں۔

"عزیز اینڈ اسمعیل جنرل سٹورز" ایسی مشہور دکان تھی جس کو بمبئی کا بچہ بچہ تک جانتا تھا، اس کی شہرت کی وجہ زیادہ تر یہ سننے میں آئی ہے کہ وہ بالکل نئے مغربی اصول پر چلائی گئی تھی۔ سوائے عزیز اور اسمعیل کے، جو شرکار کمپنی تھے، تمام کارکن صنفِ نازک کی دلکش صورتیں۔ ربن لیس یعنی فیتہ وبیل وغیرہ کے حصّہ کی انچارج رضیہ تھی اور روپیہ پیسہ کی نگراں حمیدہ

تھی۔ تحویل داری کے منصب پر رضیہ کے مقرر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیٹھ اسمٰعیل
کی دور دراز کی رشتہ دار بھی تھی۔ حمیدہ اور اس کے علاوہ اور سب محض تنخواہ
پانے والی خادمہ تھیں۔ حمیدہ کو اگر رضیہ سے لاگ تھی تو ایک حد تک بجا تھی
آپ خود غور کیجئے۔ حمیدہ سیٹھ عبدالعزیز کی آوردہ تھی جو بلحاظ حصّہ کے شریک
غالب تھا اور اس وجہ سے ایک کم حصّہ دار کی آوردہ کا اس سے اچھی جگہہ پر
مقرر کیا جانا اُسے شاق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڈھے عبدالعزیز سے
اس کھُلّم کھُلا حق تلفی کی شکایت ضرور کرتی، لیکن قسمت ایک ایسی نظر نہ آنے
والی ہوا ہے جو دفعتاً اِدھر سے اُدھر پلٹ جاتی ہے۔ رضیہ اور حمیدہ کی
دلی لاگ کا بیج ابھی بویا ہی گیا تھا کہ فالج نے سیٹھ عبدالعزیز کو چارپائی کا
اور کچھ دن کے بعد قبر کا شکار بنا دیا۔ عبدالعزیز دکان ہی نہیں بلکہ دنیا
سے کنارہ کر گیا اور اب حمیدہ تنہا اور بیکس رہ گئی۔ ایسی صورت میں آپ خود
سمجھ سکتے ہیں کہ عبدالعزیز کی موت کا حمیدہ کو کس قدر رنج ہوا ہوگا۔ یہ صاف
ظاہر ہے کہ حمیدہ اور رضیہ کی لاگ جڑ پکڑتے پکڑتے عناد اور حسد کی سرحدیں
داخل ہو گئی تھی اور یہ آگ اب پانی ڈالنے سے اور زیادہ بھڑکتی نظر آتی تھی،

عبدالعزیز کی زندگی میں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ حمیدہ نے رضیہ کے لباس پر،
اس کی رفتار گفتار پر، نکتہ چینی کی، ایک مرتبہ، اگر حافظ غلطی نہیں کرتا تو
یہاں تک ہوا کہ حمیدہ نے رضیہ کی ساری باندھنے کے طریقہ پر اس کے سامنے
دوبدو نقص نکالا، لیکن اب، اب جب کہ عبدالعزیز کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے
بند ہو گئیں تھیں وہ اپنے آپ کو کمزور اور بے یار و مددگار پاتی تھی سچ ہے

کہ رقابت اور حسد کا جذبہ ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ یہ جذبہ اچھا ہے یا بُرا
صنف نازک میں بہت جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ نیں پورے طور پر یہ بھی نہیں
کہہ سکتا کہ ایک نوجوان عورت میں دوسری نوجوان عورت سے کن کن باتوں میں
رشک یا حسد پیدا ہوتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس طبقہ میں رشک و
رقابت کے شعلہ زن ہونے کے ہزاروں، بلکہ لاتعداد طریقے ہیں۔ حسن و محبت
کو چولھے میں ڈالئے، زیور، لباس، نموں، طرزِ گفتار، اور خدا جانے
کیا کیا چیزیں ہیں جن پر فوراً شعلہ کی طرح جذبہ رقابت و حسد بھڑک اٹھتا ہے
مجھ سے پوچھئے تو یہ مضمون بھی اس قابل ہے کہ کوئی جدت آمیز دماغ،
کوئی طبّاع فلاسفر، اس کی پوری پوری تشریح و تعریف کردے، امید
کی جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے آخری حصہ میں کوئی جینس (غیر معمولی ذکاوت
سے آراستہ دماغ) پیدا ہو اور اس مسٔلہ کی پوری پوری تدقیق و تدوین کرے
مختصر یہ کہ میں اس کوچہ سے نابلد محض ہوں اور اس لئے میں اس پر کسی
قسم کی، یعنی پرانی شمعِ شب افروز کی، یا نئے برقی لیمپ کی، روشنی
نہیں ڈال سکتا، اس لئے آپ مجھ سے اس معاملہ پر رائے زنی
کی اُمید نہ رکھیں۔

یہ میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ جنگ رقابت و رشک برابر جاری رہی،
اور عبدالعزیز کی موت کے ساتھ رضیہ کا پلّہ بہت جھک گیا۔ ایک واقعہ
نے تو تقریباً تمام نوجوان لڑکیوں کو حمیدہ کا طرف دار بنا دیا۔ اس دکان
کا قاعدہ یہ تھا کہ خریدار جو کچھ خریدتا اُس چیز کا بل اس کو دے دیا

جاتا تھا جس کو لے کر وہ تحویل دار کے پاس جاتا اور وہاں قیمت مندرجہ بل ادا کر کے اپنی چیزیں لے جاتا۔ غالباً جمعہ کے روز کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کچھ فیتے اور بیلیں لینے آیا۔ جس کی قیمت انتخاب و پسند کے بعد حمیدہ نے جو اس شاخ کی نگراں تھی۔ ایک روپیہ دو آنے بتائی۔ وہ بل لے کر تحویلدار کی میز پر پہونچا اور چوں کہ ریزگاری اس کے پاس نہ تھی اس لئے اس نے بل کے ساتھ دو روپیہ رضیہ کے حوالے کئے۔ رضیہ نے ایک سرسری نظر ڈال کر اُسے تار میں لگا دیا اور میز کی دراز کھینچ کر عام اس میں رکھنے کے بعد ۱۲؎ اس شخص کو واپس دیدئے یہ تو ظاہر ہے کہ اس کو بارہ آنوں پر تعجب ہوا اور وہ ان کو لئے ہوئے پھر حمیدہ کی میز پر پہونچا۔

میرا خیال ہے آپ نے قیمت شاید عہ بتائی تھی اور یہی بل میں رکھی ہو گی؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں بے شک۔ یہ ہی۔ کیوں؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ غالباً بل کے پڑھنے میں غلطی ہوئی۔ مجھے صرف ۱۲؎ دو روپیوں میں سے واپس ملے ہیں"۔ اگرچہ وہ خود نہایت تہذیب کے ساتھ یہ کہہ رہا تھا، کہ بل کے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو گی" مگر حمیدہ کو اس قدر بات ملجانی کافی تھی۔ آپ جانتے ہیں جنگ حسد میں، بلکہ تقریباً ہر جنگ میں، ایک حریف اپنے مقابل کو کم از کم ذلیل کرنے میں بھی وہی لطف اٹھاتا ہے جو شکست دینے یا پسپا کرنے میں۔ حمیدہ اس شخص کو اپنے ساتھ لئے ہوئے۔ بلکہ سچ

تو یہ ہے کہ تیزی میں اُس سے دو قدم آگے، رضیہ کے سر پر شبخون مارنے والے غنیم کی طرح جا پہونچی۔ جا پہونچی اور بلا توقف ایک خاص وقار آمیز ترشی کے ساتھ کہنے لگی :-

"تم نے اس بل میں دو آنہ کیوں زیادہ لئے؟ قیمت صرف ۱۲/ میں نے لکھی تھی اور تم نے بجائے چودہ آنہ کے بارہ آنہ واپس کئے ہیں"

رضیہ (بل کو تار میں سے نکال کر دیکھتے ہوئے) "میں نے اس رقم کو ۱۴/ پڑھا۔ یہ دو کا ہندسہ صاف نہیں لکھا"

حمیدہ۔ خوب۔ گویا ابھی تم کو اسکول کی ضرورت ہے۔ میری نظر میں تمھارا یہ جواب قابلِ لحاظ نظر نہیں آتا۔ یہ بہت واہیات ہے۔ اگر شریف خریداروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے گا تو بہت جلد دکان میں کتے لوٹتے نظر آئینگے تم کو دکان کے نام و عزت کا خیال رکھنا چاہیئے"۔

"واقعی مجھ سے غلطی ہوئی"! اُس نے ندامت کے ساتھ جواب دیا اور خریدار صاحب سے عجب ندامت آمیز لہجہ میں مخاطب ہوئی۔ "میں آپ سے نہایت شرمندہ ہوں اور اس غلطی کی معافی چاہتی ہوں"

"نہیں۔ نہیں۔ کچھ نہیں۔ آپ اس کا مطلق بھی خیال نہ کیجئے۔ اُس نے جواب دیا۔

وہ تو اپنے دام پورے کرا کر چلا گیا۔ مگر رضیہ کے دل و دماغ پر ایک عجیب اثر چھوڑ گیا۔ وہ اس کھلم کھلا توہین کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اور اسی وجہ سے یہ پورا واقعہ سیٹھ اسمٰعیل کے کان تک من وعن پہونچا دیا گیا۔ رضیہ کا

پیٹھ پیچھا ہے۔ اور خدا کو جان دینی ہے، سچ یہ ہے کہ یہ واقعہ محض غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ورنہ آپ خود اندازہ کیجئے دو سو تین سو روزانہ آمدنی کی تحویلدار رضیہ آٹھ پہیلی پر اپنا ایمان اور نیت خراب کرتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دشمن کو اپنے دلی بخار نکال لینے کا موقع چند لمحوں کے لئے اچھال گیا۔ اور حمیدہ۔ آپ کو ماننا پڑے گا۔ بہت کچھ کہہ گزری۔ سیٹھ اسمٰعیل کو حمیدہ کی یہ حرکت ناگوار ہوئی تو حق بجانب تھا، کیوں کہ رضیہ لاکھ تنخواہ پانے والی خادمہ سہی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ خون کا لگاؤ تو تھا۔ سیٹھ اسمٰعیل نے اُسی روز حمیدہ کو تمام متعلقین دکان کے روبرو اس نامعقول حرکت پر کسی قدر ترش لہجے میں۔ مگر مہذب الفاظ میں، فہمایش کی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ نکلا وہ قطعی بجا تھا۔ اُسی روز سے ہر خادمہ رضیہ کے آگے پیچھے رہنے لگی، اور حمیدہ جب دکان سے شام کو گئی تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، اُس کے قدم زور زور سے پڑ رہے تھے، اور اس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

(۲)

دنیا فانی اور ناکارہ ہو یا نہ ہو، لیکن ظاہر پرست اور مطلب پرست ضرور ہے، جس قدر دنیا نوسی استقلال اور جہالت آمیز جوش گھٹتا جاتا ہے اُسی قدر مطلب پرستی اور طاقت پرستی بڑھتی جاتی ہے۔ موجودہ مہذب و تعلیم یافتہ دنیا سائنس کو اپنا مذہب سمجھتی ہے اور سائنس یہ صاف طور پر بتاتی ہے کہ دو طاقتیں جب ایک دوسری سے ٹکرائیں گی تو زبردست یقیناً کمزور کو پسپا کردے گی، اب کوئی وجہ نہیں کہ مہذب دنیا ہمیشہ طاقت ور کا ساتھ

نہ دے، کیوں کہ کمزور کی حمایت لینا نہایت غیر فطری اور اصول سائنس کے خلاف ہے۔ کمزور ہستی کو جس قدر جلد دنیا سے خارج کر دیا جائے، اسی قدر اچھا ہے، کیوں کہ یہ مانا جاتا ہے کہ کمزور کا وجود مستقبل کے لئے ضرر رساں ہے۔ کمزوری کی وبا پھیلاتا رہے گا اور کمزوری کا بیج بوتا رہے گا۔ اُس کی نسل اس سے بھی زیادہ کمزور ہوگی، اس لئے نہایت محفوظ اور موجودہ طریقہ یہی ہے کہ کمزور و ناچار کا بیج ہی دُنیا سے اُڑا دیا جائے۔

رضیہ کی طرف داری سیٹھ اسمٰعیل نے لی کہ ساری دکان والیاں اُس کے گرد و پیش رہنے لگیں۔ اور حمیدہ کا ساتھی۔ سوائے بیوقوف، کم عمر، ناتجربہ کار، سارہ کے اور کوئی نہ رہا۔ سارہ ابھی نو عمر تھی۔ ابھی اس نے سترھویں سال میں قدم بھی نہیں رکھا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی پہلی روش کے موافق اب بھی حمیدہ کی ساتھی تھی۔ اس نادان لڑکی کو چھوڑ کر باقی تمام نوجوان عورتیں رضیہ کی میز پر پروانوں کی طرح جمع رہتیں۔ ظاہرا ہر طریقہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رضیہ نے حمیدہ کو پسپا کر دیا اور عنقریب وہ اطاعت قبول کر لے گی۔

سیٹھ عبد العزیز کو قدرت نے تموّل میں بہت زیادہ حصّہ دیا تھا لیکن اس زیادتی کو امساک ظاہر کر کے پورا کر لیا تھا۔ عبد العزیز نے دولت بہت کچھ چھوڑی۔ لیکن اولاد کے نام اللہ کا نام تھا۔ مرنے سے دو روز پیشتر بذریعہ وصیت نامہ اُس نے اپنا تمام مال اپنے بھتیجے عبد المقیط[1] کے نام منتقل کر دیا۔

---

[1] مقیط کے املا کے ذمہ دار خود عبد المقیط ہیں جو اب تک اس کو اسی طرح لکھتے ہیں اور لکھا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔
(جوشؔ)

اور اس لئے اب اس کا وارث جائز تنہا وہی تھا۔ مقیط دو سال ہوئے کہ اسکول سے پاس ہوکر کالج کی سرحد میں داخل ہوا تھا اور علی گڑھ ایم اے او کالج کی پکی بارگ میں زندگی گزار رہا تھا، چچا کے مرتے ہی، بلکہ ترکہ کے ہاتھ آتے ہی۔ اُس نے کالج کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی۔ اور وہ، باوجود صرف ایک مہینہ الیف کے امتحان میں باقی رہنے کے، امتحان میں شریک ہونے کی راہ نہ دیکھ سکا۔

جس روز سے دکان میں یہ معلوم ہوا تھا کہ مقیط عبدالعزیز کا جانشین قرار پایا اُسی روز سے دوکان کا ایک ایک متنفس اس کے آنے کے دن گن رہا تھا یہ ظاہر ہے کہ اب وہ شریک غالب تھا اور دکان آیندہ اُسی کی ہدایت اور پسند پر چلنے والی تھی۔ حمیدہ بھی اپنی ظاہری مصیبت خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہی تھی۔ تمام لڑکیوں کے طعن و تشنیع یضحیک آمیز فقرے، پھبتیاں، سب ہی کچھ سُنتی۔ لیکن سُنتی اور پی جاتی۔ ہیں تو ہیں۔ غالباً سارہ بھی جو اُس کی تنہا مونس تھی۔ یہ نہیں بتا سکتی کہ وہ اس وقت اپنے دل میں کیا منصوبے باندھتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اوروں کی طرح اس کو بھی عبدالمقیط کی آمد کے ساتھ کسی انقلاب کی اُمید ہو۔ تاہم اس کی دلی اُمیدیں پردہ راز میں تھیں اور رہیں۔

مقیط نے حتی الامکان آنے میں بہت جلدی کی، مگر پھر بھی بمبئی پہنچتے پہنچتے اُسے کم و بیش ایک مہینہ لگ ہی گیا۔ سب جانتے تھے کہ مقیط نوجوان ہے، آزاد خیال ہے، اور خوبصورت ہے، لیکن اس کا علم کسی کو نہ تھا کہ

وہ دلکش اور بااثر بھی ہے ۔ مقیط جس روز اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے، پلش
ہیٹ لگائے، بچے تلے قدم رکھتا، دُکان میں داخل ہُوا وہ بھی عجیب دن تھا۔
کسی کو اُس کے آنے کی ٹھیک تاریخ معلوم نہ تھی ۔ مگر حمیدہ اب بھی
قسم کھاتی ہے کہ رضیہ کو پہلے سے علم تھا اور اسی وجہ سے وہ اس روز غیر
معمولی دلکش لباس پہنے ہوئی تھی ۔ جو کچھ بھی ہو، مقیط سیٹھ اسمعیل کے ساتھ
ساتھ اندر گھُسا، ہیٹ اُتار کر ہاتھ میں لئے ہوئے اس نے چاروں طرف
نظر ڈالی اور باتوں میں مشغول ہال کے بیچوں بیچ میں رُکا ۔ یہ تو سب نے
اچھی طرح دیکھ نہیں پایا تھا کہ اس کی تجسّس آمیز نظر صنفِ نازک کے چہروں
پر دوڑ لگاتی ہوئی حمیدہ کی شکل پر کسی قدر ٹھہری تھی ۔ لیکن سب نے
دیکھ لیا اور اچھی طرح دیکھ لیا کہ اُس نے آفس کے کمرہ میں جانے سے
پیشتر قصداً حمیدہ کو پھر دیکھا اور غور سے دیکھا ۔

حمیدہ خود کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہو ۔ یا مقیط کی تیز اور
گہری نظر کی گرمی اس کے گداز اور نرم رخساروں پر محسوس ہوئی ہو ۔
کچھ بھی ہو ۔ اس قدر صاف معلوم ہو گیا کہ حمیدہ کی گردن کچھ لمحوں کے
اندر کئی انچ اونچی ہو گئی اور اس کے چہرہ پر شباب کا خون بل مارنے لگا
رضیہ کی جو کچھ حالت ہوئی اس پر سارہ آج تک جب کبھی یاد کرتی ہے،
بیساختہ ہنس پڑتی ہے، مقیط کی آمد نے اُس کے دل و دماغ پر وہی اثر
کیا جو بلوچر کی آمد نے نپولین پر کیا تھا ۔

ہوا کا رخ پلٹتے ہی دوکان کے متعلقین کا رنگ بھی بدل گیا سچ بھی

یہ ہے کہ جب مقیط اپنے اوقات فرصت میں حمیدہ کی میز کے قریب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا نظر آتا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اور تمام نوجوان لڑکیاں جو اس سے پیشتر اس کا مضحکہ اُڑاتی تھیں۔ اب اُسی طاقت پرستی کے اصول کے موافق ایک ایک کرکے اس کی طرف دار نہ ہو جاتیں۔ مقیط کے طبّاع ہونے میں اس کے کالج کے دوستوں میں سے ایک کو بھی اختلاف نہ تھا، اور وہ ایک ہی ہفتہ میں دکان کے متعلقین اور ان کی ظاہری حالت سے اچھی طرح واقف ہو گیا۔ البتہ سارہ اس زمانہ میں بیماری کی وجہ سے چھٹی پر تھی۔ اس کی بابت مقیط کوئی رائے نہ قائم کر سکا۔

خود سیٹھ اسمٰعیل کے الفاظ ہیں کہ "مقیط کے آنے سے دُکان کا کاروبار دُگنا چمک گیا" اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دُکان کے عروج کا زمانہ اور اس کی آمد ایک ہی تاریخ سے شروع ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس نے در اصل پوری محنت کے ساتھ تمام معاملات میں خود دلچسپی لینی شروع کی اور خود ایک ایک الماری کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرنا شروع کیا۔ سیٹھ اسمٰعیل کو اس کی موجودگی سے بڑا آرام ملا اور وہ کوئی کام بلا مقیط کی رائے کے کبھی کرنے کی جراٴت نہیں کرتا تھا۔ رضیہ اب پسپا ہونے سے بھی زیادہ گر گئی اور اس کی کسی شکایت کو اسمٰعیل پوری ہمدردی کے ساتھ نہیں سُنتا تھا۔ ایسی صورت میں سوائے خاموشی کے ساتھ اپنا کام روزانہ انجام دینے کے سوائے اور وہ کیا کرتی؟

ایک روز آفتاب ابر غلیظ کا اسیر ہو گیا تھا؛ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی۔ اور بارش ہلکی ہلکی پھوار کی صورت میں برابر جاری تھی۔ ایسا سماں تھا جس سے نوجوان طبیعت میں خواہ مخواہ رہ رہ کر گدگدی محسوس ہونے لگے۔ ایسی بونداباندی میں خریداروں کا ہر روز کے موافق آنا تو معلوم؛ اس نئے دکان کے متعلقین تقریباً بیکاری میں وقت گزار رہے تھے۔ مقیط آفس سے نکل کر ہال میں آیا اور وہاں سے ٹہلتا ہوا دروازہ تک پہونچا وہ بھی اس وقت سگار سلگائے، ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے، ہال سے دروازہ تک اور دروازہ سے ہال تک برابر ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی حمیدہ کی میز کے پاس ٹھہر کر دو ایک باتیں بھی کر لیتا تھا، ورنہ زیادہ تر سگار کے راکھ بنانے میں دھواں دھار کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی طبیعت پر بھی بھیگی ہوئی ہوا کا پورا پورا اثر تھا۔ وہ کچھ کہتا بھی تو مذاق آمیز لہجے اور تبسم نما دہانہ کے ساتھ کہتا۔ نہ صرف حمیدہ سے بلکہ کئی ایک سے اُس نے خطاب کیا اور جن الفاظ میں، بلکہ جن تیوروں کے ساتھ اُس کو جواب ملا وہ افسوس ہے کہ میری کمی علم کی وجہ سے تحریر کے محدود دائرہ میں نہیں آسکتا۔

یہ وقت اور یہ کیفیت تھی جب کہ دروازہ کے قریب کسی کے بے تحاشہ بھاگتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی۔ مقیط ٹہل تو رہا ہی تھا، قدم بڑھاتا ہوا دروازہ میں تھا کہ رُکتے رُکتے بھی بھاگ کر آنے والے سے ٹکرا گیا۔ اب ایک عجیب قوت مدافعانہ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے سے

الگ ہو گئے، الگ ہو گئے مگر نظریں مل گئیں۔ آنکھیں لڑ گئیں۔ مقیط ایک ناقابل بیان حیرت کے ساتھ جس میں حیرت کے علاوہ ایک اور جذبہ بھی جھلک مار رہا تھا سامنے والی تصویر انسانی کو دیکھ رہا تھا۔ اور، اور سارہ، کیوں کہ یہ آنے والی وہی تھی۔ خدا جانے کس خیال سے اپنی لڑ جانے والی نگاہوں کو پلکوں کی زنجیروں میں باندھ کر زمین پر گرا دینا چاہتی تھی، اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ریشمین ساری کا آنچل ڈھلک کر سینہ کے اُبھار اور شانوں کی روک تھام سے، گرنے سے بال بال بچ گیا۔ بے تحاشا دوڑنے کی وجہ سے غیر معمولی سرخی چہرہ پر دوڑ گئی تھی۔ چھتری جو ایک ہاتھ میں تھی سیدھے کندھے پر گر گئی تھی، اور وہ کیفیت جو اس وقت یکایک مقیط سے ٹکرا جانے سے پیدا ہوئی تھی سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا، کہ کیوپڈ[1] کا تیر کون سی ادا کی صورت میں ترازو ہوا، لیکن ہوا ضرور مقیط کی چلبلی طبیعت یہ حالت دیکھتی اور وقار کو، جس کا خیال مس ماڈ ایلین نے بھی بہت کم کیا، قائم رکھتی؟ وہ کچھ جھجکا مگر ساتھ ہی اس کے ہاتھ قابو سے باہر ہو گئے۔ اُس نے سارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "آئیے آئیے، اندر تشریف لائیے (کسی قدر مسکراہٹ کے ساتھ) کیا صرف مینھ سے پناہ مقصود ہے یا کچھ خریدنے کے

---

[1] کیوپڈ (CUPID) حسن کا دیوتا۔

لئے تکلیف گوارا کی ہے؟"

"جی نہیں، میرا نام سارہ ہے" اس نے جواب دیا۔

یہ جواب مقیط کو نہایت مہمل معلوم ہوا، مگر سچ یہ ہے کہ ایک خادمہ جو محض اتفاق سے اپنے آپ کو کسی اور نظر سے دیکھے جانے پر متاثر ہو رہی ہو، آقا کو سوا اس کے اور کیا جواب دیتی، آپ کو ماننا پڑیگا ایسے مہمل فقرے بڑے گہرے جذبات اور نہایت لطیف معنی اپنی تہ میں لئے ہوتے ہیں۔

مقیط۔ "میں آپ کا نام سُن کر نہایت ممنون ہوا۔ آپ اندر تشریف....."

حمیدہ نے اپنی میز پر سے بات کاٹ کر کہا "مسٹر مقیط، یہ سارہ وہی لڑکی ہے جس کا میں آپ سے اکثر ذکر کر چکی ہوں، یہ موزہ اور بنیان کی انچارج ہے"

مقیط (ہاتھ میں ہاتھ لئے ہوئے) اچھا وہ ہیں جواب تک چھٹی پر تھیں"!

"جی ہاں" سارہ نے آنکھیں جھکائے ہوئے اور آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

—— (۳) ——

ہمارا مقصد یہ نہیں کہ اس واقعہ کو شیریں و فرہاد کی داستان بنا دیں، محض زمانہ کے اتفاقات کا بیان سمجھئے۔ اوّل سے آخر تک سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ حمیدہ کا عبدالعزیز کی موت کے ساتھ گر جانا اور رضیہ کا بڑھ جانا، پھر مقیط کی آمد کے ساتھ معاملہ کا برعکس ہو جانا، یہ سب کچھ کیا تھا؟

محض اتفاق . مگر اسی نت نئے روپ بدلنے والے اتفاق نے رضیہ اور حمیدہ میں اچھے خاصے نفاق کی بنیاد ڈال دی تھی.

یہ صحیح ہے کہ دوسرے روز مقیط کے اشارہ پر حمیدہ سارہ کو اپنے ساتھ لے کر رات کا کھانا کھانے ایک پُرتکلف رستوران میں گئی تھی. لیکن اس وقت یکایک مقیط کا پہنچنا. مقیط سے اگر اس وقت پوچھا جاتا تو محض اتفاق تھا، اب حمیدہ کا سارہ کو انٹروڈیوس کرانا - پرائیویٹ زندگی میں انٹروڈیوس کرنا، اور مقیط کا شریکِ دعوت ہونا یہ سب اسی اتفاق کا نتیجہ تھا- اس کے بعد مقیط کا شریکِ دعوت ہونا اور بھی حیرت انگیز اتفاق تھا اور پھر ڈنر ختم ہوتے ہی باہر نکلنے پر ایک گاڑی کا موجود ہونا سب سے بڑا اتفاق تھا بائیسکوپ کا لطف تینوں طبیعتوں نے اپنے اپنے مذاق کے موافق بالکل علیحدہ اٹھایا. حمیدہ مقیط کے خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر چکی تھی اور کر رہی تھی لیکن دراصل اس کی طبیعت متنغّص تھی، اس لئے اس کو تمام فلم نہایت روکھے پھیکے نظر آئے . مقیط کی طبیعت کا پارہ اس وقت بوائلنگ پوائنٹ (BOILING POINT) سے بھی اوپر تھا اس لئے ایک ایک نظارہ اس کو دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا تھا، اور سارہ کو نیند آرہی تھی اس لئے اس کی نسبت ہم کوئی رائے نہیں لگا سکتے.

تماشہ ختم ہوتے ہی اسی گاڑی میں پہلے حمیدہ کو اس کے گھر تک پہونچایا اور وہاں سے گاڑی چھوڑ کر پیادہ پا سارہ کو اس کے مکان تک پہنچانے چلا کیوں کہ سارہ اور حمیدہ کے مکان میں صرف دو تین مکان اور ایک چھوٹا سا

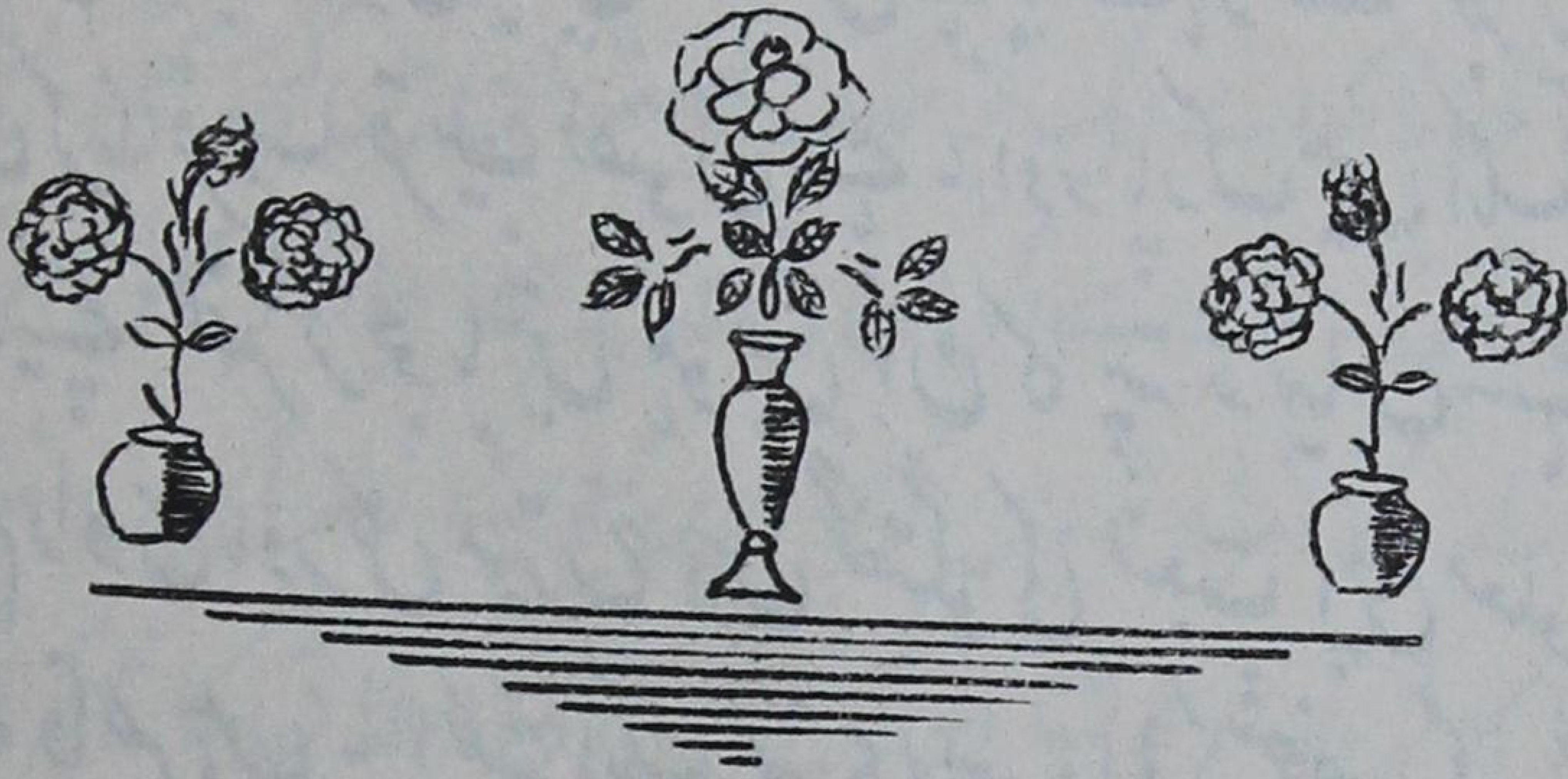
پارک حائل تھا، سارہ نے مقیط کو اس تکلیف گوارا کرنے سے باز رکھنے کے لئے بہت کچھ کہا، مگر مقیط کو جانے اس تکلیف میں کیا لطف تھا کہ وہ نہ مانا۔

راستہ میں جو معمولی باتیں، خاص جذبہ لئے ہوئے لہجہ میں، ہوتی رہیں ان کا بیان کرنا قریب قریب فضول ہے، اور پارک میں ایک نارنگی کے درخت کے نیچے ٹھہر کر جو باتیں ہوئیں اُن کا پتہ نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے، تمام راوی اور کل مورخ اس گفتگو کی نسبت اپنی معلومات کی شعاع ڈالنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ایک بڑی سودائی شخص کی زبانی اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ گفتگو کسی لحاظ سے نرالی نہیں تھی۔ آج سے دو ہزار برس پیشتر ایک جوان گڈریئے، بانسری بجانے والے گڈریئے، اور ایک نوعمر لڑکی کے درمیان، جو اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے لائی تھی۔ دریائے فرات کے کنارے پر قریب یہ ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ الفاظ اور زبان میں چاہے کچھ بھی فرق ہو لیکن جذبہ وہی فرات کے کنارے بانسری بجانے والے گڈریے کا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس کے پورے دو مہینے بعد رضیہ اور حمیدہ کے نفاق کا خاتمہ ہوا، اور وہ بھی حسن اتفاق سے۔ یعنی نہ مسز مقیط۔ جس کو دو مہینہ پیشتر صاف سارہ کہا جاتا تھا، بیچ میں پڑتیں اور نہ اس جنگ رقابت کا خاتمہ ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت سے حمیدہ، رضیہ اور سارہ میں

ایسا اتحاد قائم ہو گیا ہے، جو یورپ کے اتحادِ ثلاثہ سے کہیں زیادہ مستحکم اور سچائی پر مبنی ہے۔



جذبِ دل کی تصویریں

جذبِ دل کی تصویریں

جذب دل ایک قوّت ہے ناقابلِ وزن، ایک کشش ہے ناقابلِ تجزیہ، پیدا ہوتی ہے بغیر پیدا کئے اور ناپید ہوتی ہے بغیر ناپید کئے۔

جسم انسانی کا مرکز نظام، جذبات گوناگوں کا گہوارہ، دماغ، جب اپنے عمل وردِ عمل کا جال تمام اعضائے انسانی تک پہونچاتا ہے تو تھپیڑے کی ہوا کھانے والا مضغۂ لحم سیماب صفت بن جاتا ہے۔

یہ ہی برق معمور پارۂ لحم۔ جذبۂ محبت کا نقطۂ موہوم، شاعری کی جان، موسیقی کا مخزن، نقاشی کی روح رواں قرار پاتا ہے۔

اس کو جذب سے وہی تعلق ہے جو ریڈیم کو روشنی سے، آفتاب کو نور سے، حُسن کو پرتو سے، یا خاکم بدہن، تجھ کو مجھ سے۔

اس کا درد لذّت انگیز، اس کی لذّت درد افزا،

یہ غنچۂ ناشگفتہ۔ جو نسیم سحری کی ہلکی سی گدگدی سے تبسم زیر لب کے ساتھ مقناطیس فطر بن جاتا ہے۔ کبھی نہ ہوتا اگر وہی پہلو میں رہ رہ کر اٹھنے والا درد لذت انگیز نہ ہوتا۔

---

[1] ہمایوں جون ۲۲ء

یہ چشمۂ نغمۂ نواز کی چلبلی اور سُبک رو لہروں سے دست و گریباں ہو جانے والی آفتاب کی شعاعیں جو زمین کے نشیب و فراز کے ساتھ روپہلی سنہری روپ بھرتی، ڈوبتی، اچھلتی، دیدہ و دانستہ آنکھوں میں گھسی آتی ہیں، کبھی ہرگز نہ ہوتیں۔ اگر وہی سینہ کو آتش کدۂ جذب بنا دینے والی لذتِ دردِ افزا نہ ہوتی۔

ناممکن ہے کہ سب کچھ ہوتا اور یہ نہ ہوتا۔ ممکن ہے کہ کچھ نہ ہوتا اور یہ ہوتا۔

جذبِ دل کائنات کی روحِ رواں۔ مطرب کا گلو۔ نقاش کا قلم، شاعر کی زبان، اس کا ذریعۂ خود نمائی۔

جس وقت سے دیکھنے والی آنکھوں کا وجود ہے، اسی وقت سے ان ذرائع خود نمائی کا وجود ہے۔

نغمہ، نقش اور شعر، یقیناً۔ مغنّی، نقّاش اور شاعر کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا وجود ازل سے ہے تو دوسرے کا وجود بھی ازل سے ہونا چاہیئے۔

نغمہ، نقش اور شعر کیا ہیں؟ حُسن کی، اور اس سے پیدا ہونے والے جذبِ محبّت کی طرح بہ طرح خود نمائی۔

خود نمائی ایک مہمل سی حرکت قرار پاتی ہے اگر دیکھنے والی آنکھ نہ ہو ایسی آنکھ خارج میں نہ ہونے سے اس کا عدم وجود لازم نہیں آتا، حسن خود نما بذات، جذبہ خود بینی سے متصف ہے!

خود نمائی و خود بینی دوش بدوش وجود میں آتی ہیں۔

معمہ نگاری برطرف، جذبِ محبّت کے عامل و معمول افرادِ انسانی کے ہر دو طبقات یکساں رہے ہیں۔

کسی ایک طبقہ کو عامل اور دوسرے کو معمول قرار دے دینا نقّاش و شاعر کا رجحانِ طبع ہے اور بس،

فی الحقیقت اس جذبہ کے لحاظ سے ذکور و اناث میں سر مو فرق نہیں؛ دونوں عامل ہیں، دونوں معمول؛ یا دونوں عاشق ہیں دونوں معشوق۔

دو مختلف الخیالات اشعار سے محض دو مختلف الطبائع شاعروں کا پتہ چل سکتا ہے۔

ایک ہی جذبہ کے دو مختلف اللون نقوش صرف نقاش کی طبیعت کی وسعت بتاتے ہیں۔

جذبہ ہر حالت میں وہی ہے۔ خواہ صنف قوی عامل ہو یا صنف نازک،

نقّاش کو جس طرح نقشِ جذبات میں، اپنی طبیعت کے موافق، زیادہ سرور آتا ہے۔ وہ فطرتاً اسی کو اختیار کرے گا۔

دیکھنے والے کو جس نقش میں زیادہ کیف نظر آئے، اس کی مرضی۔

عیب جوئی و مناقشہ ناظر کے عیوب ہیں۔ اظہار دلائل و منطق، نقاش و شاعر کے ناقابل معافی گناہ ہیں۔

موازنہ و مقابلۂ نقوش۔ بشرطیکہ اس کی بنا حسد و نقص جوئی پر نہ ہو،

جوہریٔ نقش کی صفتِ ضروری ہے۔

مختلف زمانہ کے نقاشوں کی طبع آزمائی اُس زمانہ کی شعریت وجذبِ دل معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۱)

نینی تال کے اس حصّہ میں جہاں تلّی تال کا جگمگاتا پانی بپایۂ کوہستانی کے پیندے میں عجیب نظر فریب شان سکوت کے ساتھ غرق محویت نظر آتا ہے، اور اس وقت جب کہ پہاڑوں پر جھاڑ دینے والا دُخانِ سحاب مخلوقاتِ متحرک وغیر متحرک کو محض اپنے مس ہو جانے سے نم کر چکا تھا، ایک موٹر بوٹ پر دو صورتیں، پہلو بہ پہلو، فطرتِ بوقلموں کی حسن پاشی اور نظر نہ آنے والے دست قدرت کی دلربا دست کاری کی لذّت یابی میں مستغرق تھیں۔ پہاڑ پر چمکنے والا آفتاب سحاب دخانی کے اڑنے والے گالوں سے چادر چھپول کھیلنے میں مصروف تھا اور رہ رہ کر پانی کی سطح پر لوٹ جانے والی دھوپ کی شعاعیں تلی تال کو سنہری تال بنا جاتی تھیں، کشتی پر محوِ نظّارہ، یا غرقِ جذبات ہونے والی صورتوں کے چشم وابرو ایک دوسرے کے ساتھ عمل وردِّ عمل کا پتہ دیتے تھے۔ دونوں چہرے بال کے وبال سے صاف تھے، ایک فطرتاً، دوسرا دو سیفٹی ریزر کی امداد سے، دونوں سر ننگے تھے، ایک پر چھوٹے چھوٹے بھورے بال اور دوسرے پر سنہری بل کھانے والی زلفیں۔ جو چھوٹی چھوٹی لٹوں کے

پھلتے گوری گردن کے اِدھر اُدھر خوبصورت کانوں سے سرگوشی کرنے کے لئے چھوڑتی ہوئی خود کمر تک جا پہونچی تھیں۔ دونوں جذبۂ اتصال طلب سے معمور تھے، دونوں نظرِ اغیار کی مداخلتِ بیجا سے گریزاں تھے، اور دونوں قصّہ مختصر کسی نہ کسی طرح ایک ہونا چاہتے تھے۔

نوجوان اپنی کیفیتِ اندرونی کے اظہار کا فرضِ مقدس، مدِّ مقابل کے محراب ابرو کے سامنے، لہجۂ شوق لب ریز کے ساتھ ادھ کٹے جملوں میں ادا کرچکا تھا، نازنین جذبۂ مشترک کی اشتعال آفرینی کو تصنّع خودداری سے دبائے، الفاظ مسرّت محرک کے میٹھے میٹھے گھونٹ، گرم رخساروں، عرق آلود جبیں، اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ پی چکی تھی۔ پی چکی تھی، اور ان کا سرورِ خود فراموشی، دل سے لے کر دماغ تک۔ ہر سانس کے ساتھ بڑھتا یا رہی تھی۔ ایک، مجسّم التجائے تمنّا لب ریز، دوسری، سرتاپا رضائے شرم آمیز، ترشیح دخانی کے تازے پانی میں نہائی ہوئی ہوا کا ایک شریر جھونکا تلّی تال کی سطحِ مصفا پر پھیلتا، خاموش لہروں کو گدگداتا، موٹر بوٹ تک پہنچا اور آن واحد میں دونوں اجسامِ جذبات معمور کے ساتھ وہی عمل کر گیا جو شامپین کا دور آخریں کسی مجلس بادہ پیمائی میں مخمور دماغ کے ساتھ کرجاتا ہے۔ کوہستان کی سطح ناہموار پر۔ آفتاب و سحاب کی چادر چھپول کی بدولت دھوپ چھاؤں کا مدو جذر اِدھر اُدھر لہر یں مارتا نظر آتا تھا، دیکھنے والی نظریں کبھی روشنی کو سایہ کے پیچھے، دوڑتا ہوا مشاہدہ کرتی تھیں، "سایہ روشنی کو پکڑنا چاہتا تھا یا روشنی سایہ کو" ایک ایسا معمہ تھا جس کو کوئی نہ حل

کر سکا۔ البتہ اس مشاہدۂ مناظر سے پیدا ہونے والا کیف، دماغ گرم کو آتشکدۂ جذب بنا جاتا تھا۔ نوجوان کی چشم تمنا وا ہوئی، نازنین کا سر تسلیم خم ہوا۔ "میری پیاری روحِ رواں" کا جملہ ایک زبان سے نکلا "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید" کا جواب دوسرے کے سکوت نے دیا۔ نوجوان کا سر جھکا، نازنین کا چہرا اس کی طرف مڑا، آنکھیں دو چار ہوئیں، دو دل مل گئے!

(۲)

صوبۂ متوسط کے اُس حصہ میں جہاں راجہ بھیم کے طاقت ور ہاتھ وِدَارْبھ کی عنانِ حکومت سنبھالے ہوئے تھے، اور اس وقت جب کہ نشادہ کی ہمسایہ راجدھانی پر راجہ نل حلم و عفو کے ساتھ انصاف گستر تھا، حسین دمینتی کے آفتابِ حسن نے اپنی شعاعوں کا انعکاس ہر چہار سمت شروع کیا۔ دمینتی کے حُسن نے خصوصیت کے ساتھ نوجوان نل کے دل و دماغ پر وہ کیا جو آفتاب شیشۂ آتشیں پر کرتا ہے! اور طرحدار نل کی زور آوری و ہر دل عزیزی نے بھولی بھالی دمینتی کے جذبات نو خیز پر ردِّ عمل کرنے میں "جواب ترکی بہ ترکی" دیا۔ نل۔ جلوۂ منو۔ فخر روزگار تھا، دمینتی "دعائے جہانتا دمن" افتخارِ لیل و نہار تھی۔ مرغ پیغامبر "راج ہنس" نے جذبات طرفین کو جذب محبت میں مبدّل کر دیا۔ رفتہ رفتہ کشش باہمی، اجتماع شرافت و حسن کا دیباچہ بن گئی۔ یہ لیل و نہار تھے کہ راجہ بھیم کو اپنی حسین کنیا دمینتی کے حدود شباب میں قدم رکھنے کا احساس ہوا، اور اس احساس کا ہونا

تھا کہ نوجوان راجپوتوں کو اس حسین مہ جبین کے انتخاب زوج کے لئے شرکت سیمبر کی دعوت عام دی گئی۔

مقدّس بھارت ورش کے ہر گوشہ سے نکیلے، سجیلے چھتریوں کا ٹڈّی دل۔ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ وِدَاربھ کی راجدھانی کی طرف چل نکلا، ہاتھیوں، گھوڑوں اور رتھوں کی تعداد کثیر نے، قطع مسافت میں ایک طبقۂ ارض کو آسمان ہشتم بنا دیا، ناردا اور پاربت نے کوہ مرو سے جنت کے سورگ کی راہ لی، اور دیوتائے سحاب، اندر کے مرکزِ سکون کو دمینتی کے حُسنِ صبر سوز کی رام کہانی سُنا کر جنبش دی، دیوتا بھی حسن ہوش رُبا سے کیف حاصل کرنے کے لئے پرتھوی کے مشہور راجہ بھیم کی حدود راجدھانی میں شرکتِ سیمبر کی غرض سے نازل ہوئے؛

سیمبر کا روز مقررہ آیا۔ دوپہر کے قریب تمام راجہ مہاراجہ اپنی اپنی فرودگاہوں سے ایوان جشن میں بلائے گئے، ہر نوجوان راجپوت انمول جواہرات زیب سر و گوش کئے، نکھ سے سِکھ تک بنا سجا، ایوان وسیع میں داخل ہوا، راجہ بھیم کے اظہارِ خلق و مہمان نوازی کا لُطف اٹھاتا ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک تختِ مرصع پر متمکن ہو گیا، تمام ایوان وسیع اظہارِ شان و شوکت سے جگمگا اُٹھا، تمام مجلس کوشش خود نمائی سے گرما گئی۔ تمام نوجوان منچلے اپنی آن بان کی نمایش انتہائی میں ایسے شیرانِ پرغیض کی تصویر بن کر رہ گئے، جو ایک ہی شکار کی تلاش میں دفعتاً آمنے سامنے ہو گئے ہوں۔

اسی اژدہام زیبائش و خود آرائی میں طرحدار نل بھی ایک گوشہ میں مضطرب تمناؤں کو روکے، نچلے نہ رہنے والے دل کو تھامے، غرق جذبات امید و یاس تھا، اس کے پہلو میں چاروں دیوتا، اندر، اگنی، ورون اور یام، بصورتِ انسان، محبت و حسن کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھنے میں موجود تھے، ان کو حسین دمینتی اور نوجوان نل کے باہمی جذبات کا علم اچھی طرح ہو چکا تھا، اسی لئے وہ گل کھلانے پر آمادہ نظر آتے تھے، تمام مجلس گرم پر سکوتِ موت طاری ہو جاتا ہے، ہر صورتِ خنداں پیکر تصویر بن جاتی ہے، ایک ایک نگاہِ شوق و تمنا میں ڈوبی ہوئی، آنے والی حسن کی پتلی کی طرف کھینچ کر رہ جاتی ہے، جب مہ جبینِ دمینتی سیمبر کی مجلس میں داخل ہوتی ہے۔ سرخ ریشمی محرم اور بنارسی ساری اس کے دلآویز تناسبِ اعضا کو اپنا سحر سامری کرنے کا پورا موقعہ دیتے ہیں، طلائی و مرصع تاگڑی کمر نازک کے حدود بالائی و زیریں کے نشیب و فراز کا اظہار ناقابل بیان دل فریب رنگ میں کرتی ہے، جڑاؤ جھومر اور بے بہا آویزہائے گوش، جبینِ نظر فریب اور رخسار سرخ و سفید پر اس غضب کی جھلک ڈالتے ہیں کہ ناظرین بلا ارادہ کوشش ہمہ تن چشم بن کر رہ جاتے ہیں، سر سے پیر تک رعنائی و عنفوان شباب کی کیفیت ایسی بلا کی کرشمہ نمائی کرتی ہے کہ ایک ایک عضو کی نظر کے لئے کم از کم ایک دل کی حاجت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ اپنے گورے نازک ہاتھوں میں ایک

خوشنما ہار لیے، نظر نیچی کیے، آہستہ آہستہ قدم رکھتی اس محفلِ شوق میں داخل ہوتی ہے۔ داخل ہوتی ہے، اور ہزاروں گرم گرم نظریں سر سے پیر تک اس پر ٹوٹ جاتی ہیں، صاف و شفاف پیشانی پر دوشیزگی و بھولے پن کی حیا ننھے ننھے شبنم کے سے قطرے پیدا کر دیتی ہے، محسوس نہ ہونے والا سانس تیز رفتاری سے کام لیتا ہے، سبک رفتار قدم وزنی ہو جاتے ہیں، اور وہ کسی قدر بڑھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔

اس آنِ واحد میں ہر راجپوت دل ایک غرور آمیز انگڑائی لیتا ہے، ہر منچلا دماغ بجائے خود مقناطیس محبت بن جاتا ہے۔ ہر جوان اپنے سینہ و بازو پر نظر ڈال کر اکڑ جاتا ہے، مگر دمینتی کی جھکی ہوئی نظریں اس مہمل اظہارِ حسنِ فریبی کو مطلق نہیں دیکھتیں۔

دمینتی دراصل ایک صورت کو پہلے سے ہی اپنے پہلو میں جگہ دے چکی تھی اور اب وہ محض اسی کی متلاشی تھی، وہ رک رک کر حجاب و حیا سے بار بار اجازت لیتے ہوئے، کن انکھیوں سے چاروں طرف نظر غلط انداز ڈال رہی تھی، دیکھتے دیکھتے وہ اس طرف بڑھی، جہاں مضطرب نل امید و بیم سے دست و گریباں ہو جانے کی کیفیت میں محو تھا۔ مگر قریب پہنچتے ہی وہ پھر سکتہ کے عالم میں تھی۔ یہاں دوش بدوش پانچ نل اُسے جلوہ آرا نظر آتے تھے! اس کا دل دھڑک رہا تھا، شرم و حیا نے اُس کے اوسان کھو دیئے تھے، وہ ہزار ہزار

کوشش کے بعد بھی ان پانچوں صورتوں میں سر مو فرق نہ معلوم کر سکی۔

ہر صورت اس کی نگاہ متجسس کو اپنی طرف کھینچے لیتی تھی، ان میں سے ہر ایک اُسے راجہ نل معلوم ہوتا تھا، دماغ بتاتا تھا کہ نل ایک ہے، آنکھیں بتاتی تھیں کہ "نہیں پانچ ہیں"۔ دل مچلتا تھا کہ مجھے اپنے دل ربا سے کام ہے! بے چاری دمینتی آنکھیں بند کر کے دیوی حسن و محبت کی جناب میں تخیلات کی امداد سے جھک گئی اور بصد زاری اپنی امداد کی التجا کرنے لگی۔

نل کا روپ دھارن کرنے والے دیوتا، نل کے دوش بدوش، امتحان جذبۂ محبت میں مصروف تھے۔

دمینتی نے اُن کی نہ جھپکنے والی آنکھ سے، یا پرچھائیں نہ پڑنے والے جسم لطیف سے، ان کو تاڑ لیا۔ مگر پھر بھی خوف و رجا کا عالم اس پر طاری تھا۔

حُسن کی دیوی ہو یا عشق کا دیوتا، ایک غیبی رہنمائی اس کے پریشان دل کو آخر کار یک بیک نصیب ہوئی۔

اُس نے اپنے محبت معمور دل سے دستگیری چاہی، نظریں جھکائیں، نل کو اپنے ہی اندر تلاش کرنا چاہا، اور ایک چشم زدن، فوراً آگے جھک کر، ان پانچوں صورتوں میں سے ایک کے گلے میں ہار ڈال ہی دیا آنکھیں اُٹھیں، نظریں ملیں اور واقعی دمینتی کا جذبۂ محبت راجہ نل کے گلے کا ہار تھا۔

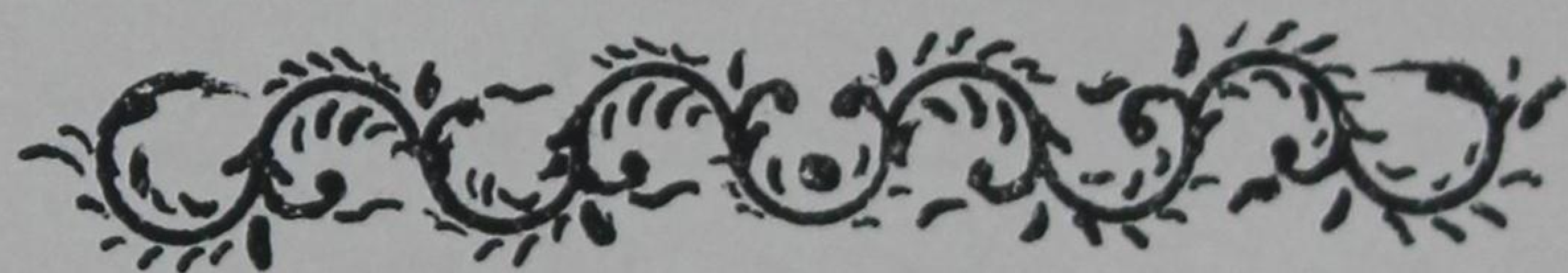
قیس عامری مدعی ہے کہ لیلیٰ کے حسنِ صبر سوز پر اُس کا عاشق ہوکر جان دینا بالکل قرینِ فطرت ہے۔

دمینتی کہتی ہے کہ نل کے جذبِ صادق کی قدر دمینتی کے انتخابِ عشاق سے بدرجہا بیش بہا اور شعریت معمور نظر آتی ہے۔

میں متحیّر ہوں کہ لیلیٰ کے دیوانہ کو فرزانہ سمجھوں یا ہندوستان کی شرم و حیا کی پُتلی کو،

ایک سودائی چیخ اٹھتا ہے۔ کہ ؎

عشق لیلیٰ نیست ایں کارِ من است
حُسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است!



خانه جنگی

خانہ جنگی

ہندوستان کے ہر گوشہ سے آج کل خانہ جنگی کی مذمت نہایت اونچی آواز میں الاپی جا رہی ہے۔ خیریت یہ ہے کہ ۷۵ فی صدی مذمت کرنے والے محض اوپری دل سے عالمگیر آواز کے ساتھ سُر ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور ۲۰ فی صدی اپنے دلی معتقدات کے اظہار کی ہمت نہیں پاتے۔ مشکل سے ۵ فیصدی ایسے ہونگے جو دراصل خانہ جنگی کو فعلِ مذموم سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوں ——
اگر خدانخواستہ تمام غل مچانے والے فی الحقیقت خانہ جنگی کو فعل مذموم تصور کرنے لگتے تو غالباً زندگی اجیرن ہو جاتی۔

خانہ جنگی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے سب سے سیدھا اور سہل ممتنع نظر آنے والا استدلال یہ ہے کہ خانہ جنگی بھی دراصل جنگ کی ایک قسم بہ لحاظ مکان ہے۔ جنگ بحری جنگ بری، اور جنگ ہوائی کی طرح جنگِ خانہ بھی ایک قسم کی جنگ قرار پائے گی۔ اب اگر جنگ انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے تو خانہ جنگی بھی مفید ہو سکتی ہے! جنگ اگر شعار زندگانی ہے تو خانہ جنگی بھی شعارِ انسانی ہے! جنگ اگر مقتضائے تہذیب و ترقی ہے تو خانہ جنگی بھی مقتضائے تہذیب و ترقی ہے۔

جنگ کے شعارِ انسانی اور مقتضائے تہذیب و ترقی ہونے کے لئے کسی زبردست بحث کی حاجت نہیں، تاریخِ اقوام کی خوبی ہر خیال تمام مخالف

دلائل کا زندہ جواب سمجھی جا سکتی ہیں - پھر جو رائے جنگ کے لئے قائم
کی جائے وہی خانہ جنگی کے لئے بھی قائم کی جائے گی، کیونکہ جو حکم
کُل کے لئے لگایا جائے وہی جزو پر عائد ہو گا - جنگ کے فعلِ مستحسن
قرار پا جانے پر صرف اس قدر کہنا باقی رہ جاتا ہے کہ ہر نیکی کا آغاز گھر
سے ہوتا ہے - کوئی وجہ نہیں کہ جنگ کی برکات سے اپنے گھر کو محروم
رکھا جائے اور محض پڑوسی کے گھر کو اُس سے فیض یاب ہونے
دیا جائے -

اس سیدھے اور سہل استدلال کے علاوہ خانہ جنگی کو مختلف اصولوں
پر، کسی قدر عمیق نظر سے بھی جانچا جا سکتا ہے -

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

سب سے پیشتر نظریۂ حیات کو لیجئے -

لوازماتِ حیات میں تنازعہ کا وہی مرتبہ ہے جو جسم جاندار میں
جان کا! کائنات کا ایک ایک ذرّہ تنازعہ للبقاء کے اصول پر قائم
و کاربند ہے -

حیات کیا ہے ؟ ________ تسلسلِ کش مکش - یا مجموعہ تنازعات

موت کیا ہے ؟ ________ عدمِ احساس - یا - امن مطلق

اگر یہ طاقتِ تنازعۂ للبقاء تمام کائنات سے صلب ہو جائے تو وجود گوناگوں
ایک لخت عدم تاریک سے بدل جائے -

این جہاں جنگ است کُل چو بنگری (مولانا روم)

تنازعہ اس لحاظ سے ایک فعل فطری ثابت ہوتا ہے اور خانہ جنگی سے گھر کو ناآشنا رکھنے کی کوشش بالکل ایسی ہی حماقت نظر آتی ہے کہ گھر قوانین فطرت کے خلاف قائم کیا جائے۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

اب فلسفۂ نیک و بد کے لحاظ سے نظر ڈالئے:۔

دنیا کی کوئی شے بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری، انسان کا کوئی قول و فعل فی نفسہٖ نہ نیک ہے نہ بد، اچھی سے اچھی چیز کا بھی ایک تاریک رُخ ہے اور بُری سے بُری شے کا بھی ایک روشن پہلو ہے۔ کسی شے کا اچھا یا بُرا مانا جانا اُس کے کارآمد یا مضرت رساں ہونے پر مبنی ہے۔ یعنی۔ ایک شے اگر نسبتاً زیادہ صورتوں میں مفید ہے اور کم صورتوں میں مضر تو اس کو اچھا کہا جائے گا اور اس کے برعکس ہو تو بُرا تصور کیا جائے گا۔ گویا۔ کسی شے یا فعل کے نیک و بد ہونے کا انحصار اس کے کارآمد مضرت رساں ہونے کے تناسب پر ہے؛ کارآمد مضرت رساں ہونا قطعی طور پر انسانی ضروریات سے وابستہ ہے، اور انسانی ضروریات ہمیشہ تغیر پذیر۔ نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ کسی شے یا فعل کا انسانی رجحانِ احتیاج کے بدولت نیک یا بد قرار پانا ہمیشہ متغیر ہوتا رہے گا۔

مثالاً (۱) عریانی کو لیجئے:۔

ایک زمانہ تھا کہ لباس انسانی معلومات سے خارج تھا، برہنگی اس دور میں شعارِ انسانی تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کپڑے کی ایجاد ہاتھ آتے ہی ستر پوشی لوازمِ انسانی
کی اہم شے قرار پاگئی اور افراسیاب کی لڑکی منیژہ بھی فردوسی کے قلم سے
اپنی شرافت کے استدلال میں یہ دعوے پیش کرنے لگی کہ

منیژہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اب پھر ۔ کم از کم مغرب میں ۔ یہ زمانہ آتا ہے کہ پاکبازی و ذوقِ نظر
کے اوصاف حاصل ہو جانے پر لباس ایک بار ناگوار قرار پاتا ہے اور
حسنِ مادر زاد کا نظر فریب اظہار اس درجہ خوبی تصور کیا جاتا ہے کہ اُس
کی عملی تلقین و تشہیر (DEMONSTRATION AND ADVERTISEMENTY) کی خاطر مس ماڈ ایلن کو جابلستان کا سفر اختیار
کرنا پڑتا ہے۔ فی الحقیقت ، عُریانی ، ایسے زمانہ میں جب کہ حسیاتِ حیوانی
تعلیم رائج کے زیر سایہ معدوم ہونے کی حد تک پامال ہو چکی ہوں اور کپڑے
کے دام ملکی درآمد و برآمد کے بدولت دو بالا ہو گئے ہوں، نسبتاً زیادہ
مفید اور برائے نام مضرت رہ جاتی ہے ۔عریانی کا ایک ادنی کرشمہ یوں
بیان کیا جاتا ہے کہ "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا" اور
اس میں شک نہیں کہ الٹے سیدھے کا امتیاز رفع ہو جانے پر اور کچھ نہیں
تو یہی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے جامہ کو آنکھیں بند کر کے جاہے
جس رُخ سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مفلسی پر غور کیجئے۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے کان سیم وزر کے نام تک سے نا آشنا تھے ہر متنفس بے سیم وزر یعنی مفلس تھا اور مفلسی اس زمانہ میں شانِ انسانیت تھی۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ سیم وزر کا پتہ چل جانے پر، مال و دولت حاجت براری کا ذریعہ قرار پا گئے اور مفلسی تکلیف دہ سمجھی جانے لگی، مگر پھر بھی اطمینان قلب کی خوبی افلاس ہی میں تسلیم کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ

دو قرصِ نان اگر گندم است یا از جو ۔۔۔ دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بچار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع ۔۔۔ کہ کس نہ گوید ازیں جا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فروں تر نزدِ ابنِ یمین ۔۔۔ ز فرِ مملکتِ کیقباد و کیخسرو

اب ایک زمانہ آتا ہے کہ دولت - اور محض دولت - جوہر شرافت و روحِ انسانیت قرار پاتی ہے - سیم وزر کو "ستارِ عیوب و قاضی الحاجات" کا مرتبہ خداوندی مل جاتا ہے اور مفلسی بدترین عیوب تصوّر کی جاتی ہے۔ مفلسی کے اسباب کے متعلق ایک دوسرے کو متہم کرنے لگتا ہے۔

ایک کہتا ہے کہ گوشت خوری سے اسراف پیدا ہوتا ہے اور اسراف سے مفلسی؛ دوسرا کہتا ہے کہ گوشت خوری انسان میں اس وقت سے پیدا ہوئی جب وہ قلاش ہونے کی وجہ سے جنگل کے جانوروں سے پیٹ بھرنے پر مائل ہوا۔ سبزی خور کا دعوے ہے کہ گوشت خوری مفلسی کا پیش خیمہ ہے، اور- گوشت خور کا استدلال ہے کہ مفلسی گوشت خوری کی بنا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مفلسی کو سبزی خوری سے لے کر گوشت خوری تک کسی "خوری" سے تعلق نہیں البتہ چغل خوری اور حرام خوری خارج از بحث ہیں۔

فی الحقیقت مفلسی ایسی بُری چیز نہیں جیسی کہ سمجھی جاتی ہے مفلسی کی موجودہ خوبی یہ ہے کہ وہ فاقہ مستی کا عادی بناتی ہے اور فاقہ و فقر نفس کُشی کی پہلی سیڑھی ہے۔ فاقہ مستی کے زیرِ سایہ قحط و وبا کے نتائج نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کئے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ انسان کو خود فراموشی کا مرتبہ اعلیٰ حاصل ہو جاتا ہے۔ فاقہ مست کا ہاتھ حسب حیثیت اپنے ہی مُنہ کی طرف جائے گا در شکم سیر کا ہاتھ حسب حاجت گوش مدعی کی جانب؛ یہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا؟"

(۳) ملازمت پر نظر ڈالئے :-

ایک زمانہ تھا کہ انسان کسی دوسرے ہم جنس کا مطلق تابعِ فرمان نہ تھا، ہر شخص اپنی بھوک کھاتا اور اپنی نیند سوتا تھا۔ تمام عالم مساوات کا مکمل نمونہ تھا۔

پھر ایک زمانہ آیا کہ کھیتی اور بیوپار کے بعد چاکری بھی شیوۂ زندگی قرار پایا جو بھیک کے سوائے سب سے بدتر مانا گیا۔ اب بھی یہ ایک وطیرۂ مذموم ہی رہا۔ اس قدر مذموم کہ عمر خیام کی رائے میں" دو دن میں ایک روٹی اور ایک کوزہ بھر ٹھنڈا پانی میسر آجانا اپنے جیسے دوسرے انسان کی خدمت کرنے سے بدرجہا افضل تھا۔

یک نان بہ دو روز گر شود حاصل مرد ۔۔۔ وز کوزہ شکستہ دمے آبے سرد
مامورِ دگر کسے چرا باید بود ۔۔۔ یا۔ خدمتِ چوں خودے چرا باید کرد؟

اب زمانہ آتا ہے کہ غلامی آزادی سے بہتر اور ملازمت دنیا بھر کے مشاغل

سے افضل قرار پاتی ہے؛ تجارت کمتر اور زراعت زیادہ تر محض جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ کا شیوۂ حیات بن جاتے ہیں، ملازمت اس درجہ چوٹی کی خوبی مانی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصدِ انتہائی، تربیت کا مقصدِ آخری، بلکہ، حیات کا مقصدِ واحد نظر آتی ہے، انسان پڑھتا ہے تو ملازمت کی خاطر نیک اطوار بنتا ہے تو ملازمت کی خاطر، عبادت کرتا ہے تو ملازمت کی خاطر، اور جیتا ہے تو ملازمت کی خاطر، سُنتے آئے تھے کہ بھیرویں کی راگنی ایک ایسی راگنی ہے جو صبح کے علاوہ اور اوقات میں بھی کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، مگر اب دیکھتے ہیں کہ چاکری کی دُھن، سوہنی سے لے کر بھیرویں تک اور ملہار سے لے کر گجری تک، ہر راگنی پر ہر وقت و ہر موسم میں غالب آجاتی ہے۔

(۴) چند دیگر عادات کا تغیر مجملاً ملاحظہ کیجیے:۔

انسان پہلے جینے کی خاطر کھاتا تھا، اب کھانے کی خاطر جیتا ہے، پہلے مذہب کی خاطر لڑتا تھا، اب لڑنے کی خاطر مذہب اختیار کرتا ہے، پہلے انسانی آبادی کی خاطر حیوانات کا استیصال کرتا تھا، اب حیوانات کی خاطر انسانی آبادی کا قلع قمع کرتا ہے۔

اس موقع پر یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ آپ امثال مذکورہ سے یہ نہ تصوّر کرلیں کہ ایک چیز کا نیک سے بد ہو جانا ایک عرصۂ دراز کے تغیر پر منحصر ہے — در اصل ایسا نہیں ہے۔ انقلابِ احتیاج - یا - تغیرِ میلانِ طبع کسی مدّت کا محتاج نہیں! یہ بتدریج بھی صورت پذیر ہوتا ہے اور فی الفور

بھی —— گردشِ ایام کے ساتھ ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے اور حالاتِ گرد وپیش کے اعتبار سے بھی۔

مثالاً :— راست گوئی یا — دروغ گوئی ایک ایسا فعل ہے جو ایک ہی زمانہ میں محض حالات گرد وپیش کے اعتبار سے عیب بھی ہے اور ثواب بھی۔ راستی اگر عبادت کی شان ہے تو دروغ فنِ لطیفہ کی جان ہے۔ راستی دہقان کی جھونپڑی اور خدا کے گھر میں نیکی ہو، مگر محفلِ مشاعرہ اور مجلسِ مباحثہ میں بدی ہے ؛ دروغ غلامی کی حالت اور نزع کی کیفیت میں عیب ہو، مگر ایوانِ سلطنت اور عدالت کے کمرے میں خوبی ہے۔

اسی طرح :- چہل قدمی —— جوان آدمی کے لئے حماقت ہے اور سن رسیدہ کے لئے ضرورت !

فاقہ —— مفلس کے لئے مصیبت آمیز ہے اور متمول کے لئے صحت انگیز !

کوششِ اتحاد —— شملہ کی بلندی پر عیب، جنوبی ہند کی سطح پر خوبی، اور پنجاب کی حدود میں گناہِ عظیم ہے۔

نظریۂ نیک وبد کی تشریح وتوضیح کے بعد استدلال کی تکمیل محض اس جملہ سے ہوتی ہے کہ "خانہ جنگی" بھی گردشِ ایام کے تحت میں۔ یا۔ تغیّر گرد وپیش کے اعتبار سے، عیب کے بجائے خوبی بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

محض تجربات انسانی کی بنا پر موازنہ کیجئے :-

بظاہر اس استدلال میں اہمیت نظر آتی ہے کہ "خانہ جنگی" کو دنیا ہمیشہ سے نقصان رساں سمجھتی آتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس کو مضرت رساں ہی پایا ــــ مگر بباطن یہ استدلال نمائشی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے تمام مقولات کی بنا اس کے تجربہ پر نہیں ہوتی اکثر کی بنیاد محض ہوا پر ہوتی ہے۔ وہ مقولات جو دراصل تجربہ کی بدولت وجود میں آتے ہیں ہمیشہ عمل کے موافق ہوتے ہیں۔ اور حیوانی ہوتے ہیں۔ جن کو تجربہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ عمل سے متناقض ہوتے ہیں۔ اور انسانی ہوتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل میں چند اقوال وافعال کا مقابلہ کیجیئے:۔

انسان کہتا ہے کہ "زندگی کا دارومدار پانی پر ہے"۔ یا۔ "آگ جلادیتی ہے"؛ چنانچہ وہ ہمیشہ پانی کو استعمال کرتا ہے اور آگ سے بچتا ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں بتایا جاسکتا۔ جب انسان نے پانی کا استعمال ترک کردیا ہو۔ یا۔ اپنے جسم کو آگ سے محفوظ نہ رکھا ہو۔ ایسے مقولات تجربہ کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے انسان اُن کے خلاف کبھی عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ غور کیجئے تو حیوان کو بھی آگ اور پانی کی بابت یہ ہی علم ہے اور وہ بھی پانی کو استعمال میں لانے اور آگ سے محفوظ رہنے پر کاربند ہے۔ اس قسم کے مقولات کا علم انسان وحیوان میں مشترک نظر آتا ہے اس لئے وہ کرشمۂ انسانیت نہیں مانے جاسکتے۔ بلکہ دراصل حیوانی ہیں۔

دوسری قسم کے اقوال ہیں، انسان ہمیشہ سے کہتا آتا ہے کہ "جھوٹ بولنا

بُرا فعل ہے۔" مگر ہمیشہ سے خلوت وجلوت میں جھوٹ بولتا آتا ہے۔ یا۔ انسان ہمیشہ مانتا رہا ہے کہ شراب نوشی نہایت مضر حرکت ہے مگر ہمیشہ مے آشامی پر عامل رہا ہے۔ ایسے مقولات پر عمل نہ کر سکنے سے ترشح ہوتا ہے کہ ان کی بنا تجزیۂ انسانی پر نہیں ہے اگر یہ تجربہ پر مبنی ہوتے تو انسان اُن کے برعکس عمل کرنے کی جرأت نہ کر سکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسے مقولات کو حیوان سے کوئی تعلق نہیں اور وہ محض انسان کا طرّۂ امتیاز ہیں۔ لہذا انسانی ہیں۔

اسی طرح انسان ہمیشہ کہتا رہا ہے کہ "خانہ جنگی مضر ہے" مگر ہمیشہ خانہ جنگی پر عامل رہا ہے۔ گویا اس مقولہ کو فعل سے برعکس ہونے کی وجہ سے تجربہ پر مبنی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ بھی ایک ایسا انسانی مقولہ ہے جس کو عمل سے بہت کم تعلق ہے۔ ایسے مقولات محض انسانی غلط فہمی و غلط بیانی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ　　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

❁　❁　❁　❁　❁　❁　❁　❁

انسانی غلط فہمی و غلط کاری کے لحاظ سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جو بجائے خود وقیع نہ ہو مگر برمحل ضرور ہے۔ مضمون کی طوالت کا خیال بھی اس کے بیان کر دینے کی خواہش پر غالب نہیں آتا اور میں اُس کے دُھرانے پر اُتر آتا ہوں۔

حدیثِ دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

ایک روز شام کے وقت، تمام دن قیصر ہند اور ملزم کے تنازعات میں سر مار چکنے کے بعد، میں اپنے بنگلہ کے سامنے والے چبوترے پر، آرام کرسی پر دراز، حقہ سے لطف حاصل کرنے میں مصروف تھا اور سوچ رہا تھا کہ چاروں طرف نظر آنے والے بلند درخت بھی اگر جان دار سمجھ لئے جائیں تو یہ ایک ایسی مخلوق قرار پائے گی جو یک پایہ ہے۔ کہ ---- ایک صاحب مع اپنے پنج سالہ صاحبزادہ کے دفعتاً نازل ہوئے اور ایک کرسی آگے بڑھا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ مجھے اپنے مشغلۂ تخیّل سے بادل ناخواستہ دست کش ہونا پڑا اور اُن کی مہمل گفتگو میں وقت ضائع کرنا پڑا۔ اُن کی گفتگو کا شباب تھا کہ آندھی آگئی اور ہم سب کو پوری عزّت کے ساتھ برآمدہ میں پسپا ہونا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بچّہ اپنی پھول سی ٹوپی کو حملۂ باد سے بچانے میں مصروف تھا اور ہوا کا ہر جھکڑ ٹوپی اڑا لے جانے میں زور آزمائی کر رہا تھا۔ بالآخر اس کوشش مسلسل سے عاجز آکر بچّے نے اپنے بزرگوار سے کہا "ابّا یہ ہوا نہیں مانتی"۔

"لاؤ ٹوپی مجھے دے دو" بزرگوار نے جواب دیا۔

جس قدر سوال کا بھولا پن مزہ دار تھا اُسی قدر جواب کا کھُرّانٹ پن قابلِ تنفّر تھا۔ سادہ لوح بچّے نے محض ہوا کی دست درازی کی شکایت کی تھی اور ٹوپی کے متعلق کسی امداد کی خواہش نہیں کی تھی، مگر۔ گرگ باراں دیدہ نے ہوا کا معاملہ قطعی نظر انداز کر دیا اور ٹوپی کو اپنی نگرانی میں لے لینے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مجھے اس سوال و جواب میں وہی لطف آ رہا تھا جو ایک معاملہ فہم

کو دو مختلف ممالک کے باہمی نامہ و پیام میں آتا ہے۔ بچّے کا ننھّا سا دل اپنی ٹوپی سے دست بردار ہونے پر مائل نہیں ہوا۔ تاہم۔ ہوا سے پریشان ہو کر اب اُس نے مجھ سے خطاب کیا "تم ہوا کو یہاں کیوں چلنے دیتے ہو؟"

"ہوا کو روکنا مجھے نہیں آتا۔" میں نے اُس کی بساط کے موافق جواب دیا۔

"ان درختوں کو ہٹا دو۔ پھر ہوا نہیں چلے گی۔" اُس نے بیساختہ تدبیر بتائی۔

وہ آندھی اتر گئی، وہ صحبت گذر گئی۔ مگر۔ اس معصوم ہستی کی بظاہر لائق تبسم تدبیر میرے حافظہ میں باقی رہ گئی۔ میں نے بارہا اُس پر غور کیا اور ہر مرتبہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ دنیا کے تمام ذی فہم مدبّر اور طاقت ور حکمراں اسی تدبیر پر کاربند نظر آتے ہیں۔

ہوا اور درخت کے مسئلہ میں، درخت اس جزو کو ظاہر کرتے ہیں جو مرئی ہے اور ہوا اس کو جو غیر مرئی ہے۔ ہوا ایک نظر نہ آنے والی قوّت ہے جو چلتی ہے اور درخت مادی شے ہے جس پر اس قوت کا اثر ہوتا ہے ہوا بمنزلۂ مذہب، فلسفہ اور انقلاب کے ہے اور درخت بمنزلۂ شہر، معاشرت اور انسان کے ہیں۔ ہوا کا اثر درختوں پر ہوتا ہے اور انقلاب کا اثر انسانوں پر۔ آپ نہ ہوا کو دیکھ سکتے ہیں نہ فی نفسہٖ انقلاب کو۔ درختوں کی جنبش۔ گرد و غبار کی سر گردانی، ابر کے ٹکڑوں کی دوڑ، یہ سب ہوا کے کرشمے ہیں۔ بذاتِ خود ہوا نہیں ہیں۔ اسی طرح —— بازاروں کی

ہڑتال، پولیٹیکل جلسوں کی بھرمار، اخباروں کی زبان درازی، اور شہروں کی شورش۔ سب انقلاب کے نتائج ہیں، فی نفسہٖ انقلاب نہیں ہیں۔ مشاہدہ کرنے والا نظر آنے والے نتائج سے نہ نظر آنے والے اسباب پر رائے لگائے دیتا ہے۔

ہر انقلاب وشورش کے موقع پر ایسے بھاری بھرکم افراد کا استیصال کیا جاتا ہے جو انقلاب وشورش سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ اور اس اعتماد پر کیا جاتا ہے کہ اُن کے استیصال سے انقلاب وشورش رفع ہو جائے گی۔ گویا۔ آندھی کے موقع پر بڑے بڑے درخت، جو زیادہ ہلتے ہوں، اس اُمید پر کاٹ ڈالے جائیں کہ آندھی جاتی رہے گی۔ ان دونوں تدابیر میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اس اعتبار سے میں اِس کم سن بچے کی تدبیر اور مدبّرینِ ملک کے عمل کو یکساں طور پر غلط فہمی پر مبنی پاتا ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

سب کے آخر میں خانہ جنگی کی خوبیاں قابلِ غور ہیں:۔

خانہ جنگی کی برکات کے لحاظ سے، چوٹی کی خوبی گھر کی رونق ہے۔ جس گھر میں رونق نہ ہو اس کو بقول مرزا مرحوم دشت سمجھنا چاہئے۔ فرماتے ہیں:۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

گھر کا لازمی عنصر رونق ہے، اور رونق کا انحصار گھر کی سجاوٹ پر نہیں ہے بلکہ گھر والوں کی چہل پہل پر ہے، بات چیت پر ہے، شور و غوغا پر ہے، سچ فرمایا ہے کہ "ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق"۔ اور ہنگامہ کے لئے خانہ جنگی اسی قدر ضروری ہے جس قدر اتحاد کے لئے سائمن کمیشن ـ یا ـ خوفِ عاقبت کے لئے طاعون۔

کبوتروں کی کابک والے خانہ سے لے کر انسان کے وسیع مسکن تک، ہر جگہہ خانہ جنگی کا امکان ہے۔ خانہ جنگی کی برکات بھی خانہ کے حدودِ اربعہ کی ماتحت ہیں ـ یعنی ـ جس قدر خانہ کی حدود وسیع ہوں گی اسی قدر خانہ جنگی کی برکات زیادہ ہوں گی۔ جس گھر کی چاردیواری محض میاں بیوی کے دو نفوس پر مبنی ہو اس کی خانہ جنگی بھی چولھے اور پلنگ تک محدود ہو گی۔ اگر دو نفوس میں صرف ایک ساس کا وجود اضافہ کر دیا جائے تو خانہ جنگی کی لطافت بھی المضاعف ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر خانہ کے حدودِ اربعہ ایک صوبہ یا ملک تک وسیع کر دئے جائیں تو اس کی رونق کے اسباب بھی ہنگامہ سے متجاوز ہو کر بلوہ تک پہنچ جائیں گے۔

ملکی خانہ جنگی کے زیرِ فیض ـ ہزاروں بیکاروں کو کار، فاقہ مستوں کو اُدھار، ایڈیٹروں کو موادِ اخبار، اور گرو گھنٹالوں کو عقیدت مندوں کی فوج بے شمار میسر آ جائے گی، بلکہ راجہ سے پرجا تک ہر ایک کو علیٰ قدرِ مراتب خانہ جنگی کی برکات سے مستفید ہونے کا موقع مل جائے گا۔

خانہ جنگی

خانہ جنگی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سبزی خور کو دہی میں
گوشت خور کو نمک مرچ میں نظر آتی ہیں۔ تمام افراد کار بند سے ما
فاسد خارج ہو کر ہستی کا جوہر باقی رہ جاتا ہے اور خطرۂ اجل سے
نجات مل جاتی ہے ———

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت
نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن ست

* * * * * * * * *

کسی نقطۂ نظر سے غور کیجئے۔ خانہ جنگی سے زیادہ مفید، اقتدار
محکوم ملک کے لئے موزوں، اور موجودہ آب و ہوا کے موا
کوئی دوسرا فعل نظر نہیں آتا۔ اطمینان صرف اس سے ہوت
کہ بفضلہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ نے عموماً اور ملازمت
و وکالت پیشہ افراد نے خصوصاً، اس کی برکات کو پوری طرح ذ
نشین کر لیا ہے۔

یقین مانئے آپ ایک عدد حسین بیوی اپنے ساتھ
کر کے عیش و آرام نہیں پا سکتے ہیں۔ عیش و آرام پاکر ایک د
بیویاں وجود میں لا سکتے ہیں۔

اسی طرح

آپ اتحاد کے ذریعہ سے انقلاب تک نہیں پہنچ سکتے۔ ا

قلاب کے توسل سے اتحاد پا سکتے ہیں۔

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود
امشب ز دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

